گنجِ گرانمایہ

یکے از تصنیفات

علامہ نصیر الدین نصیر ہونزائی

ریسرچ ایسوسی ایٹ یونیورسٹی آف مونٹریال

کنیڈا

خانۂ حکمت۔ ادارۂ عارف

گنجِ گرانمایہ

(پس منظر)

امامِ عالیمقامؑ کے علمی عجائب و غرائب

بقلمِ علامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی

ریسرچ ایسوسی ایٹ یونیورسٹی آف مونٹریال کینیڈا

خانۂ حکمت ـــــ ادارۂ عارف

۳ر اے نورویلا- ۲۶۹، گارڈن ویسٹ کراچی - ۳

(پاکستان)

دُرجِ گوہر

یہ گویا انمول موتیوں کا صندوقچہ ہے
جو ادارہ عارف امریکا کی "یاسمین نُور علی برانچ"
کے توسط سے گوہر شناسوں کی خدمت میں پیش
کیا جاتا ہے، نُور علی مانجی اور ان کے خاندان
کی بے شمار خدمات ہیں۔

Institute for
Spiritual Wisdom
and
Luminous Science
Knowledge for a united humanity

فہرستِ مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱	تعارف	۵
۲	تین عظیم سوال	۱۵
۳	صمصامِ علمی	۳۵
۴	ایک عمدہ سوال	۴۷
۵	سفر اور مشاہدات	۵۲
۶	خزائنِ خُدا	۵۷
۷	چند سوالات و جوابات	۶۲
۸	دستِ خُدا کی حکمتیں	۶۷
۹	نامۂ اعمال	۷۷
۱۰	عقلی بہشت کی نعمتیں	۸۵
۱۱	مربُوط حکمتیں	۱۰۰
۱۲	سلامتی کی حکمتیں	۱۱۶
۱۳	مقاماتِ نُور	۱۳۲
۱۴	ایک عظیم علمی تحفہ	۱۵۲
۱۵	اِبداع اور اِنبعاث	۱۶۲
۱۶	اظہارِ احسانمندی و شکرگزاری	۱۸۳

تعارف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ جہاں اللہ تبارک وتعالیٰ کے انتہائی عظیم احسانات وانعامات ہُوا کرتے ہیں، وہاں ہزار گونہ لاہوتی مسرّت و شادمانی اور جذبۂ شکرگزاری کیوں نہ ہو، دینِ اسلام کی یہ سب سے اعلیٰ عقلی اور عرفانی نعمتیں اِس لئے میسّر ہیں کہ خُدائے مہربان نے اپنی بے پایاں رحمت سے بوسیلۂ رسُول اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم امامِ عالی مقام علیہ السّلام کی دامنگیری اور پیروی عنایت کردی، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی فضل ورحمت کا مالک اور دونوں جہان کا حقیقی بادشاہ ہے۔

یہ بندۂ احقر راقم جو خود کو بڑے شوق سے خاکِ پائے اہلِ ایمان قرار دیتا ہے، جس کے نزدیک ہر شخص کی اصل سعادت اور کامیابی کا سب سے بڑا راز اس زرّیں اصول میں پوشیدہ ہے کہ وہ عاجزی، انکساری، اور خیرخواہی کو اپنا شیوہ بنالے، اس خاکسار کا کہنا ہے کہ یہ عمل جتنا مشکل ہے اُتنا مُفید بھی ہے، مشکل اس معنیٰ میں کہ جب

تک ایثار، قربانی، محویت، اور فنا کی عظیم حکمت سمجھ میں نہ آئے، اور یقین نہ ہو کہ کس طرح ارواحِ مومنین خدا کے امر سے جنودِ ملائکہ کا کام انجام دے رہی ہیں، تو کوئی آدمی اپنی خودی کو ریزہ ریزہ کر کے راہِ مومنین میں نچھاور کر دینے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا۔ مگر ہاں امامِ زمان صلوات اللہ علیہ وسلامہٗ کی کامل اور پُر حکمت محبّت ہی وہ واحد معجزہ ہے، جس کی بدولت ایسی ہزارہا مشکلات آسان ہو جاتی ہیں، اور مومنین ہمیشہ اس سرچشمۂ فیض سے مستفیض ہوتے آتے ہیں۔

ایمان والوں کی عزّت و خیر خواہی بطورِ خاص کیوں ضروری ہے، اس کا ایک راز اللہ پاک کے اس مبارک فرمان سے ظاہر ہے: اے رسُول یاد کرو جب تم مومنوں سے کہہ رہے تھے: "کیا تمہارے لئے یہ بات کافی نہیں کہ اللہ تین ہزار فرشتے اُتار کر تمہاری مدد کرے؟" بے شک، اگر تم صبر کرو اور خدا سے ڈرتے ہوئے کام کرو تو جس آن دشمن تمہارے اُوپر چڑھ کر آئیں گے اُسی آن تمہارا ربّ (تین ہزار نہیں) پانچ ہزار صاحبِ نشان فرشتوں سے تمہاری مدد کریگا (۳/۱۲۴-۱۲۵)

اس نورانی تعلیم سے ایک طرف تو یہ معلوم ہو جاتا ہے، کہ خداوندِ عالم کی نصرت و تائید فرشتوں کے توسّط سے ہوا کرتی ہے اور فرشتے ارواحِ مومنین ہی ہیں، اور دوسری طرف یہ اشارہ ملتا ہے کہ جس طرح جہادِ ظاہر میں سماوی تائید ممکن ہو جاتی ہے، اسی طرح جہادِ باطن میں بھی بحکمِ خدا ارواحِ مومنین کی صورت میں آسمانی مدد کا امکان

ہے، اور باطنی جہاد سے علمی جہاد مُراد ہے، جو جہالت و نادانی کے خلاف شدید جنگ ہے۔

آپ قرآنِ پاک میں یہ بھی دیکھ لیں کہ مومنوں سے فرشتوں کی کیسی دوستی ہوتی ہے، ارشاد ہے: جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا ربّ ہے اور پھر وہ اِس پر ثابت قدم رہے، یقیناً اُن پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور اُن سے کہتے ہیں کہ: "نہ ڈرو، نہ غم کرو، اور خوش ہو جاؤ اُس جنّت کی بشارت سے جس کا تُم سے وعدہ کیا گیا ہے، ہم اِس دُنیا کی زندگی میں بھی تمہارے دوست ہیں اور آخرت میں بھی، وہاں جو کچھ تُم چاہو گے تمہیں ملے گا اور ہر چیز جس کی تُم تمنا کرو گے وہ تمہاری ہوگی، یہ ہے سامانِ ضیافت اُس ہستی کی طرف سے جو غفور اور رحیم ہے (۴۱/۳۰-۳۲)" اِس مقام پر خُدا نے مہربان کی بے پناہ رحمتوں کا ذکر فرمایا گیا ہے، اور مومنوں کو اس میں کوئی شک نہیں۔

فرشتوں کی آخری تاویل امامِ حیّ و حاضر علیہ السّلام ہے، کیونکہ وہ جسم، رُوح، اور عقل کے مقام پر ایک ایسا انتہائی عظیم فرشتہ ہے کہ اس میں سب فرشتے جمع ہیں، اور ایک ایسی نہایت بڑی رُوح ہے کہ اس میں جملہ ارواح موجُود ہیں، اِس لئے کہ خُدا نے اس میں ہر چیز کو گھیر رکھا ہے (۳۶/۱۲) چونکہ وہ نُور ہے، اور نُورِ عقلِ کامل، فرشتۂ اعظم، اور انسانِ اکبر ہُوا کرتا ہے، تاکہ عالمِ جبرُوت، عالمِ ملکوت، اور عالمِ ناسُوت ہمیشہ نُورِ خُداوندی سے روشن رہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ قیامت کے دن ساری کائنات اللہ تعالیٰ کی مٹھی میں لپٹی ہوئی ہوگی، اور قرآن کی حکمت کہتی ہے کہ قیامت پوشیدگی میں ہمیشہ جاری ہے، لہٰذا اگر کسی کے لئے پردہ اُٹھ جائے تو اس کے سامنے یہ حقیقت روشن ہو جائے گی کہ ہر وقت سارے آسمان اور زمین خُدا کے دستِ راست میں محدود ہیں (۲۱/۱۰۴، ۳۹/۶۷) مگر یاد رہے کہ خُداوند تعالیٰ کا یہ کام ظاہری اور مادّی طور پر نہیں، بلکہ باطنی اور رُوحانی، اور عقلی صُورت میں ہے، یعنی آسمان زمین اپنی اپنی جگہ پر موجود اور قائم ہیں، مگر ان کا جوہر ہر وقت خُدا کھینچ لیتا ہے، جس طرح عالمِ ظاہر کو کُرسیٔ خُدا (عالمگیر رُوح) نے قاہرانہ طاقت سے گھیر لیا ہے، اور اس عمل کا نتیجہ قرصِ خورشید کی شکل میں سب کے سامنے ہے، چنانچہ اِس حقیقت میں کوئی شک نہیں کہ سُورج اِس کائنات کا مادّی جوہر ہے، اس کے یہ معنی ہوئے کہ کائنات اپنی جگہ پر قائم رہنے کے باوصف سُورج میں بصُورتِ جوہر یا بحالتِ نُور مرکوز اور محدُود ہے، اور اس کا ثبوت سُورج کا ردِّ عمل ہے جو فضائے محیط میں مسلسل روشنی کے ذرات بکھیر دینے اور شمسی توانائی کی لہریں دوڑانے کی کیفیت میں جاری ہے[1]، اسی طرح امامِ وقت صلی اللہ کا وجود

---

[1]: کائنات کی سطحِ ممدود پر کُرسیٔ خُدا کی گرفت سے جو زبردست دباؤ پڑ رہا ہے، اس کی وجہ سے کائنات کے وسط میں مسلسل سُورج بصُورتِ روشن گیس بنتا رہتا ہے، کیونکہ یہ گرفت اور دباؤ رُوحانی ہے، جو کائناتی سطح کی گولائی سے مرکز کی طرف پڑتا ہے، جس کے ساتھ ساتھ سُورج کی بھٹی میں ہمیشہ اثیری ایندھن پڑتا رہتا ہے اور اثیری ایندھن (ETHERIAL FUEL) کی تحلیل سے شعۂ خورشید پیدا ہوتا رہتا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ سُورج کُرسیٔ خُدا سے کائنات پر دباؤ ڈالنے کا نتیجہ ہے۔

آغاز ہی میں کی گئی ہے کہ ارواحِ مومنین کے ذریعے خداوند تعالیٰ کی کیسی کیسی رحمتیں اور برکتیں حاصل ہوسکتی ہیں، یہ غریب بندہ علم کے میدان میں اتنا کمزور ہے کہ کبھی اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہوسکتا، لہٰذا اسے ہمیشہ مومنوں کی حقیقی دعاؤں اور نورِ الٰہی کی تائیدات کی ضرورت رہتی ہے، چنانچہ خداوندِ قدوس کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ شرق و غرب کے بہت سے پاک و پاکیزہ دلوں نے عارفانہ یا درویشانہ دعائیں کیں، اور بہت سے شفیق و مہربان دوستوں کی صاف ستھری روحوں نے تائیدی فرشتوں کا کام انجام دیا، جس کا نتیجہ بفضلِ خدا آپ کے سامنے ہے۔ "گر قبول افتد زہے عز و شرف"

میرے بعض عزیز دوستوں نے بڑے شوق سے اِس خاکسار کو کتاب "ذکرِ الٰہی حصّہ دوم" لکھنے کے لئے فرمایا تھا، لیکن میرا کامل یقین ہے کہ اب ایک طرح سے وہ کتاب بھی (درحالیکہ بکھری ہوئی ہے) چند مقالوں میں اور خاص کر "گنج گرانمایہ" میں آگئی ہے، جس طرح کتاب "ہزار حکمت" خانۂ حکمت اور ادارۂ عارف کی تحریروں میں منتشر ہے، اِسی حالت میں آپ اس کا مطالعہ کرسکتے ہیں، اور کسی وقت کوئی محقق اسے الگ منظم اور مرتب بھی کرسکتا ہے، مگر یہ کام ادارے کی اجازت سے ہوگا۔

قرآنِ حکیم جو خدائے واحد و یکتا کی بے نظیر کتاب ہے، اِس کی پُرحکمت نصیحتوں میں سے ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ اگر کسی مومن کی کوئی

مبارک ہے، جو عالمِ انسانیت کا خورشیدِ انور ہے، پس یہاں بھی عمل اور ردِّ عمل کا قانون کارفرما ہے، اور سرچشمۂ نور کا ردِّ عمل (REACTION) یہ ہے کہ وہ ہمیشہ آفتابِ عالم تاب کی طرح نور بکھیرتا رہتا ہے۔

زیتون کے شجرۂ مبارکہ کی تاویلات میں سے ایک تاویل عالمِ انسانیت ہے، جس میں رنگ و نسل اور مشرق و مغرب کا کوئی فرق و امتیاز نہیں، جس کے پھل انسان ہیں، مغز اور تیل ان کی مجموعی رُوح اور رُوحانیت ہے، یہ تیل لمحہ بہ لمحہ چراغِ امامت میں گرتا رہتا ہے، یعنی تمام انسانوں سے ذرّاتِ ارواح کھنچ کھنچ کر امامِ مُبینؑ کی ذاتِ اقدس میں داخل ہوتے رہتے ہیں، یہاں بحکمِ خُدا کارخانۂ نور اُن ذرّات کو نور بنا لیتا ہے، مگر جب تک کسی شخص کو اس کا یقین نہ ہو، تو وہ اِس نور میں زندہ نہیں ہو سکتا ہے، جیسے ریشم کا کیڑا پروانہ (پتنگا) تو بن جاتا ہے، لیکن اِس کیڑے کو اس معجزے سے ذرا بھی لذّت و خوشی نہیں مل سکتی، کیونکہ اس کی کوئی عقل و دانش نہیں، اِس لئے وہ نہ پہلی زندگی کی اہمیّت کو جانتا ہے اور نہ دُوسری زندگی کی حقیقت کو، جس کی وجہ سے کیڑا الگ اور پروانہ الگ ہو چکا ہے، اس مثال سے علم و معرفت کی اہمیّت و افادیت ظاہر ہو جاتی ہے۔

اب اِس کتاب کا ذکر ہونا چاہئے، "جو گنج گرانمایہ" کے اسم سے موسوم ہے، یہ کتاب اُن مقالات پر مبنی ہے، جو لندن کے دَورۂ دوم کے دوران لکھے گئے تھے، اِس بات کی وضاحت اِس تعارف کے

ترقی ہوتی ہے تو وہ بار بار اپنے ابتدائی حالات کو سامنے لائے، تاکہ اِس فرق و تفاوت کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی شکر گزاری ہو سکے، چنانچہ میری ابتدائی زندگی سے متعلق ایسے بہت سے واقعات ہیں، جن کو ذہن و خاطر میں لاتے ہوئے مجھے پروردگارِ عالم کی موجودہ علمی نعمتوں کا بہت زیادہ شکر ادا کرنا چاہیئے، لیکن یہ سچ ہے کہ انسان بڑا ناشکرا ہے۔

میرے ایک عزیز دوست نے مجھ سے سوال کیا کہ آپ کے وہ تمام مقالات جو گزشتہ سال اور امسال لندن میں لکھے گئے ہیں، وہ علم و حکمت کے مغز و چاشنی سے بھرپور اور بے حد مفید ہیں، اِس کی کیا وجہ ہے؟ کیا آپ کو وہاں کا ٹھنڈا موسم بہت اچھا لگتا ہے یا فراغت و تنہائی میسر آتی ہے؟ آخر اس میں کیا راز ہے؟ میں نے بڑی عاجزی سے یوں جواب دیا کہ اگرچہ لندن کی آب و ہوا اور تنہائی میرے لئے مفید رہی، تاہم یہ کوئی خاص بات نہیں، کیونکہ میرے ملک پاکستان میں اُس سے بڑھ کر ہے، یعنی اگر سرد جگہ چاہیئے تو شمالی علاقہ حاضر ہے، جہاں میرا غریب خانہ بھی ہے، اور اگر سردی سے گریز مقصود ہے تو پھر کراچی ہے، سو لندن میں عمدہ سے عمدہ کام کرنے کی اصل وجہ میرے کچھ ایسے دوست ہیں کہ اگر وہ ازراہِ عنایت میرے ساتھ کسی بیابان میں تشریف فرما ہو جائیں، تو اُن کے مبارک آنسوؤں کی بارش سے یہ بیابان رشکِ

لندن ہو جائے گا، اور ان شاء اللہ تعالیٰ میں یہ عملی ثبوت پیش کروں گا، کہ مجھ کو خاص علمی کام کی رُوح میرے دوستوں اور عزیزوں سے آتی رہتی ہے، اور قانونِ رُوح یہی ہے۔

ادارۂ عارف برانچ لندن کے صدرِ محترم امین کوٹا ڈیا اور ان کی اہلیہ محترمہ سیکریٹری مریم کوٹا ڈیا ہمارے ایسے دو عملدار ہیں کہ ان کے زبردست تعاون اور مفید منصوبہ کے بغیر اس درویش کا دورۂ لندن کامیاب نہیں ہو سکتا تھا، امام برحقؑ کے یہ دونوں جانثار مُرید بڑے سعادت مند ہیں، کہ ان کو عبادت اور علم کا شوق ورثے میں ملا ہے، اور یہ مومنی کے تمام تر اوصاف سے آراستہ ہیں، اُنہوں نے مذکورہ برانچ کی طرف سے اور اپنی جانب سے فروغِ علم کے سلسلے میں توقع سے بہت زیادہ خدمات انجام دی ہیں، جن کا میں جان و دل سے شکر گزار اور ممنون ہوں، نیز پاکستان میں جتنے ہمارے عملدار اور ارکان ہیں، وہ سب کے سب صدر امین اور سیکریٹری مریم کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

میں اِس مقام پر خانۂ حکمت کے مرکز اور شاخوں کے جملہ عملدار و ارکان کو قانونِ وحدت کے مطابق جناب صدر فتح علی حبیب کی مبارک ہستی میں مجموع قرار دے کر موصوف کا ذکرِ جمیل کرنا چاہتا ہوں کہ صدر صاحب کو یہ بہت بڑا اعزاز حاصل ہے اور یہ ان کی بہت بڑی سعادت ہے کہ وہ خانۂ حکمت جیسے ایک اہم تاریخ ساز

علمی ادارے کے پریذیڈنٹ اور سینئر سرپرست ہیں، وہ خانۂ حکمت کی بُنیاد اور رُوحِ رواں ہیں، اُن کی ذات میں نیکی کوٹ کوٹ کر بھری ہُوئی ہے، آپ کی گنان خوانی صورِ اسرافیلؑ کا ایک نمونہ ہے، وہ میرے بیحد عزیز برادرِ رُوحانی بھی ہیں اور انتہائی عزیز شاگرد بھی، مہربان دوست بھی ہیں، اور شفیق ہمکار بھی، وہ باپ کی طرح معزز و محترم بھی ہیں، اور بیٹے کی طرح خدمت گار بھی، خُداوندِ عالم پریذیڈنٹ فتح علی حبیب اور ان کے خاندان کو دونوں عالم کی کامیابی اور سرفرازی عنایت فرمائے!

ہمارا دُوسرا فرشتۂ ارضی جو تمام مذکورہ صفات کا حامل ہے، وہ اِدارۂ عارف کے صدر عالی قدر جناب محمد عبدالعزیز ہیں جن کی پیاری ہستی میں ادارۂ عارف سے منسلک تمام حضرات جمع ہیں، خُدا کی بہت بڑی رحمت ہے کہ ہمارے دونوں صدر ذاتی طور پر بہت محنت سے کام کرتے ہیں، جس کو دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ میں ان کو اور ہر ایسے عملدار ممبر کو سر پر بٹھالوں یا آنکھوں میں بسالوں یا دل میں سمالوں، کیونکہ تعمیری محنت مجھے بیحد پیاری ہے، بلکہ وہ میری جان کی طرح عزیز و شیریں ہے، چُنانچہ میں صدر محمدؐ اور ہر ایسے عزیز عملدار و رُکن کو اپنی جان سمجھتا ہُوں جو علمی خدمت کے سلسلے میں سخت محنت سے کام کرتا ہو، ہمارے انتہائی عزیز صدر محمدؐ دیگر امُور کے علاوہ کیسیٹ لائبریری کی ترقی کے لئے بہت زیادہ محنت کرتے ہیں، وہ

ہمارے ادارے کے سرپرستوں میں بھی ہیں، ان کو علم سے عشق ہے، آپ علم و حکمت کی باتوں کو قبولتے ہوئے کبھی تو فرطِ مسرت سے مسکراتے نظر آتے ہیں، اور کبھی شکر گزاری سے آنسو بہاتے ہیں، الحمدُ للہ کہ میں نے صدر فتح علی حبیب اور صدر محمد عبدالعزیز کے آئینۂ مثال میں خانۂ حکمت اور ادارۂ عارف کے بہت سے درخشان اور تابناک چہرے دکھائے، کیونکہ سب عزیزوں کا فرداً فرداً تذکرہ ممکن نہیں۔

آپ سب دُعا کریں کہ خُداوند تعالیٰ تمام مُسلمین و مومنین کو جل اللہ کے مرکز پر یکدل و یکجہت بنا دے! مُشکلات کو آسان فرمائے! بلاؤں اور آفتوں کو دفع کرے! اور ہر دیندار کو علم و عمل کی روشنی میں منزلِ مقصود تک پہنچائے!

Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

خاکپائے جماعت
نصیر الدین نصیر ہونزائی
کراچی

سنیچر ۲۷ر ذیقعدہ ۱۴۰۴ھ سالِ موش
۲۵ر اگست ۱۹۸۴ء

تین عظیم سوال

میرے ایک بہت ہی عزیز روحانی اور علمی دوست ہیں، وہ بفضلِ ربِّ عزّت بڑے دانشمند اور اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک ہیں، آپ فی الوقت مغرب کی ایک مشہور یونیورسٹی میں دینی اور دُنیوی علم کے بلند مدارج طے کر رہے ہیں، اُنہوں نے بطریقِ علم پروری و حوصلہ افزائی اپنے ایک بیحد پیارے خط میں تین عظیم سوال بھیجے ہیں، جو علم دین اور فلسفہ دونوں کی روشنی میں بڑی دانشمندی سے بنائے گئے ہیں، لہٰذا یہ عظیم الشان ہیں، اِنشاء اللہ تعالیٰ ایسے پُرمایہ اور مفید سوالات اور ان کے جوابات سے اوّل اوّل ریسرچ اور تخلیقی کام میں مدد ملے گی، اور پھر اگر خُدا چاہے تو علمی ذخیرے میں اضافہ ہو جائے گا، وہ سوالات یہ ہیں :-

۱- حقیقی علم کے حصُول میں حواسِ خمسہ کا کتنا حصّہ ہے ؟

۲- ذہن اور رُوح کے مابین کیا رشتہ ہے، حصُولِ علم میں ان

دونوں کا کیا وظیفہ ہے ؟

۳- عبادت یا ذکر کے دوران لامکانی حدّ میں داخل ہونا اور پھر واپس زمانی و مکانی حدّ میں داخل ہونے کا عمل کس طرح بیان ہو سکتا ہے ؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم - اللّٰھمّ صلّ علیٰ محمّدٍ و آلِ محمّد۔

میں بندۂ درویش پروردگارِ عالم کی رحمتِ بے پایان کی اُمید پر اپنی پیاری رُوح کو جملہ دوستوں اور مومنوں سے فدا اور قربان کر دیتا ہُوں، اے میرے دوستو! آپ اِس بندۂ ناچیز کو اتنی بڑی عزّت و فضیلت کیوں دے رہے ہیں، ایسا نہ ہو کہ یہ فخر کی موت مر جائے، پھر آپ حضرات کو اچھا نہیں لگے گا۔ لہٰذا دوستو! آؤ مجھے پامال کر دو، مجھے روند دو، مجھے خاکپائے مومنان کہو، مجھے اِسی نام سے لذّت ملتی ہے اور اسی میں بڑی بڑی حکمتیں پوشیدہ ہیں۔

جواب ۱: ہزار گونہ عاجزی، محبّت، اخلاص اور ادب کے ساتھ حضراتِ احباب کی خدمت میں عرض کی جاتی ہے کہ سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ حقیقی علم کیا ہے یا اس کی تعریف کیا ہے، کیا اِس سے رُوحانی علم مُراد ہے ؟ ہاں، شاید اِس سے رُوحانی اور دینی علم مُراد ہے، اور یقیناً اسی کی بابت سوال ہے، چُنانچہ علم کے لُغوی معنی ہیں جاننا، اور مُرادی معنی

ہیں چیزوں کی حقیقت جاننا، پس ایسا علم جس سے اشیاء کی حقیقت جانی اور پہچانی جاتی ہے رُوحانی علم ہے، جس کا دُوسرا نام حقیقی علم ہے کیونکہ یہ حقیقت اور صحیح معنوں میں علم ہے۔

مگر اس کے ذکر سے پہلے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم علم کے درجات کو معلوم کریں، جس کے لئے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ موجودات ظاہر و باطن کی چیزیں کتنی قسم کی ہیں، آپ بخوبی جانتے ہیں کہ چیزیں تین قسموں میں ہیں: جسمانی، رُوحانی، اور عقلی، سو اسی طرح علم کے بھی تین درجات ہیں: علم الیقین، عین الیقین، اور حق الیقین، چونکہ علم کا تعلق چیزوں کی حقیقت جاننے سے ہے، اِس لئے علم کے تین مقامات مقدر ہوگئے: مقام جسم علم الیقین کے لئے، مقام رُوح عین الیقین کے لئے اور مقام عقل حق الیقین کے لئے۔

اگر پُوچھا جائے کہ علم کا نام یقین کیسے ہوسکتا ہے؟ تو اس کے لئے عاجزانہ گزارش یہ ہے کہ علم عام سے عام بھی ہے اور خاص سے خاص بھی، چنانچہ ایک ایسے خاص علم کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے جو ہر قسم کے شکوک و شبہات سے پاک و پاکیزہ ہے قرآن حکیم میں فرمایا گیا ہے: علم الیقین[1]، یعنی علم بصورتِ یقین، یقین کی

---

[1]: قرآنی ارشاد یہ ہے: ایسا نہیں، اگر تم علم الیقین جانتے ہوتے تو دوزخ کو دیکھ سکتے، پھر اس کو عین الیقین سے دیکھ سکتے (۱۰۲/۵) اس میں علی الترتیب علم الیقین اور عین الیقین کا ذکر ہے، اور حق الیقین

بہت بڑی اہمیّت اِس لئے ہے کہ حقیقی علم کا اصل سرچشمہ مرتبۂ حق الیقین ہے، یعنی چشمۂ نورِ عقل، وہاں سے درجۂ عین الیقین یعنی مقامِ رُوحانیت میں علم کا نزول ہوتا ہے، حق الیقین کے مقام سے علم کا جو ذخیرہ بوسیلۂ رسولؐ دُنیا میں ظاہر ہُوا ہے اور اس کی تعلیم عالمِ ظاہر میں جس طرح امامِ زمان دیتے ہیں وہی علم الیقین ہے۔

اب یہ کمزور بندہ حواسِ ظاہر[۲] کے بارے میں کچھ عرض کر دینا چاہتا ہے کہ حقیقی علم کے حصُول میں حواسِ ظاہر کا کتنا حصّہ ہے، سو اِس سلسلے میں حواسِ ظاہر کی تین حالتیں ہیں، پہلی حالت یہ ہے کہ جہاں تک علم الیقین کا تعلق ہے، تو اس میں حواسِ ظاہر کو بھرپُور اور مکمّل حصّہ لینا ضروری ہے، کیونکہ حقیقی علم کا یہ درجہ ظاہر اور

کے بارے میں فرمایا: اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ (۵۶/۹۵) یقیناً یہ وہی حق الیقین (یعنی مرتبۂ گوہرِ عقل) ہے۔

[۲]: حواسِ ظاہر کے تین درجے ہیں: (۱) جانوروں کے حواس (۲) جانور جیسے اِنسانوں کے حواس، کیونکہ قُرآن ہی کہتا ہے کہ وہ چوپایوں کی طرح ہیں (۷/۱۷۹، ۲۵/۴۴)۔(۳) اور وہ حواس جو مومن میں کام کرتے ہیں، اِس مثال سے ایک مومن کے حواسِ ظاہر کی اہمیّت کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے، بس جو مومن علم الیقین کی لازوال دولت کمانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں، تو یہ حواسِ ظاہر کی دولت ہے۔

جسمانیت میں ہے، دُوسری حالت یہ کہ حواسِ باطن کو جگانے کے لئے یا فعلاً اُن سے مقامِ عین الیقین پر علم حاصل کرنے کے لئے حواسِ ظاہر کو خاموش، خُفتہ یا مُردہ جیسا ہو جانا پڑتا ہے، کیونکہ جب تک ظاہری حواس کو معطّل نہ کر دیا جائے، تب تک باطنی حواس مرے یا سوئے ہی رہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ خصُوصی بندگی میں حواسِ ظاہر پر سکوت و خاموشی مسلّط کر دی جاتی ہے، اور تیسری حالت یہ ہے کہ اگر عین الیقین کے مراحل طے ہو گئے اور انفرادی قیامت برپا ہو گئی، یا جوج و ماجوج نے سدِّ ذُوالقرنین کو چاٹ کر ختم کر دیا (۱۸/۹۴-۹۹) اور باطنی حواس زندہ ہو کر ظاہری حواس کے ساتھ ایک ہو گئے تو اس وقت دونوں قسم کے حواس کو لازماً مل کر کام کرنا ہے، اور یہ ایک حقیقت ہے کہ عام حالت میں حواسِ ظاہر ہی کے مقامات میں حواسِ باطن مرے ہُوئے پڑے رہتے ہیں، یعنی باطنی آنکھ ظاہری آنکھ میں پوشیدہ ہے، باطنی کان ظاہری کان کے اندر سویا ہُوا ہے، وغیرہ۔ یہ خاکسار سمجھتا ہے کہ یہاں تک پہلے سوال کا جواب مکمّل ہو گیا۔

اِس سلسلے کی مزید معلومات کے بارے میں خاکپائے مومنان یہ عرض کرتا ہے کہ علم الیقین ظاہر ہے، اِس لئے اِس کا تعلّق حواسِ ظاہر سے ہے، عین الیقین باطن ہے، جس کا تعلق حواسِ باطن سے ہے، اور حق الیقین باطن کا باطن ہے، لہٰذا وہ عقلی مُدرکات

کو چاہتا ہے۔

امامِ اقدس و اطہرؑ کا یہ ادنیٰ غلام یوں عرض کرتا ہے کہ حصولِ حقیقی علم کے سلسلے میں حواسِ ظاہر کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ ان میں بتدریج رُوحِ قدسی بصورتِ علم پھونک دی جاتی ہے، یعنی تابعدار اور مخلص مومنین جوں جوں علمِ حقیقت کو حاصل کرتے جاتے ہیں، توں توں رُوحِ مقدس کے لطیف ذرّات ان کے باطن میں داخل ہوتے رہتے ہیں، کیونکہ بجدِّ قوّت اور بجدِّ فعل اس پاک رُوح کو دوبار پھونک دیا ہے، پہلی نفخ مرحلہ علم الیقین کے شروع سے آخر تک جاری رہتی ہے، اور دوسری نفخ نفخہ صور کے ساتھ ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ راہِ رُوحانیت کی یہ ترقی، یہ منزل، اور یہ نعمت تو صرف حضراتِ انبیاء و آئمہ علیہم السّلام کے حصّے میں آئی ہے، سو ایسے رُوحانی مقامات کا مشاہدہ اور تجربہ مومنین کو کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کے جواب میں یہ ناچیز بندہ عرض کرتا ہے کہ اِس حقیقت کے ثبوت میں سینکڑوں دلائل پیش کئے جا سکتے ہیں، تاہم اہلِ دانش کے لئے قرآنِ حکیم سے یہی ایک دلیل کافی ہے، اور وہ یہ ہے کہ خداوندِ عالم نے ازراہِ رحمت و نوازش یہ چاہا کہ سب مومنین اس کے اُن برگزیدہ بندوں کے راستے پر چلیں، جن کو اُس نے اپنی عقلی، علمی، اور رُوحانی نعمتوں سے نوازا ہے، تو اُس نے خود اہلِ ایمان کو بڑی تاکیدی ہدایت دی کہ کہو: اِھدنا الصّراط المستقیم، صراط الّذین

انعمت علیہم ہمیں راہِ راست پر آگے سے آگے لے جائیے اُن لوگوں کی راہ جن پر آپ نے انعام فرمایا ہے، یعنی ہمیں ایسی عالی ہمتی اور روشن ہدایت عنایت کر دیجئے کہ جس سے ہم شکر گزاری کے ساتھ انبیاء، صدیقین، شہداء، اور صالحین کے پیچھے پیچھے راہِ روحانیت پر چل سکیں، ملاحظہ ہو قرآن پاک (۴/۶۹)۔

اللہ تعالیٰ کی عظیم اور خاص نعمتیں تو عقلی اور روحانی صورت میں ہوا کرتی ہیں، جن کے لئے سنّتِ الٰہی صرف ایک ہی ہے، وہ یہ کہ ہر اُس خوش نصیب شخص میں رُوحِ قدسی پھونک دی جائے، جس کو خداوندِ قدوس نوازنا چاہتا ہے، اس کے بغیر روحانیت کی نعمتیں ممکن نہیں، اور اگر وہ نعمتیں نہیں تو پھر تا بعدار مومنین کس معنیٰ میں انبیاء و آئمہ کی رفاقت میں ہو سکتے ہیں، حالانکہ اطاعت کرنے والوں کے حق میں اِس رفاقت کی تعریف کی گئی ہے (۴/۶۹) پس یہاں یہ حقیقت روشن ہو گئی کہ حقیقی مومنین میں بھی رُوحِ خداوندی یعنی رُوح القدس پھونک دینے کا امکان ہے، جس کی شرط خدا و رسولؐ اور ولیٔ امرؑ کی مکمّل اطاعت ہے، اور حصولِ علم کا فریضہ بھی اِسی اطاعت کے تحت آتا ہے، نیز اسی سلسلے میں امامِ زمان صلوات اللہ علیہ کی طرف سے اسمِ اعظم کا عطیہ بُنیادی اہمیّت رکھتا ہے، یہ سب کچھ پہلے مرحلے میں بحدِّ قوّت رُوحِ خداوندی پھونک دینے کے معنی میں ہے، اور یہ منزل حواسِ ظاہر اور جسمانیت

سے متعلق ہے۔

رُوحِ خداوندی یا رُوحِ قدسی دراصل نورِ امامِ زمانؑ ہے، جو بقولِ قرآنِ حکیم (۳۶/۱۲) اپنے ساتھ کُل چیزیں لے کر آتا ہے، نور میں ایک بڑی اہم چیز انفرادی قیامت بھی ہے، یہیں سے مکمل رُوحانیت کا دروازہ کھُل جاتا ہے، اور یہیں مکمل طور پر حواسِ باطن جاگ اُٹھتے ہیں، ہر چند کہ باطنی آنکھ بہت پہلے سے کھُلی ہوئی ہوتی ہے، مگر اس کے سامنے جو رنگین روشنیوں کی دُنیا ہے، وہ خاموش اور بغیر کسی بات چیت کے ہوتی ہے۔

خُدا کی سُنّت اور قانونِ فطرت (۳۰/۳۰) ایک ہی ہے، جس کا نمونہ انسان میں پایا جاتا ہے، مثال کے طور پر: جب ضرورت ہو تو مادرِ مہربان اپنے شیر خوار بچّے کو دُودھ کی طرف راغب کر دینے کے لئے کہتی ہے کہ: "میرے لعل، یہ پستان خوبصورت ہے، اور دُودھ بڑا میٹھا" مگر جب اِسے دُودھ چھُڑاتی ہے تو وہ مثلاً اپنے پستانوں پر کالک لگا کر کہنے لگتی ہے کہ: "آخ آخ بُرا ہُوا، نہ معلوم کیا ہُوا" وغیرہ، یہ مثال اہلِ دانش کے لئے بڑی فکر انگیز ہے، چُنانچہ وہ باور کر سکتے ہیں، کہ رُوحانی اور علمی تربیت و پرورش کے سلسلے میں دایۂ قدرت و رحمت کی بھی یہی عادت ہے، جیسے قرآنِ پاک میں اصولِ ناسخ و منسُوخ (۲/۱۰۶) اور کسی چیز کو مٹا کر کسی شی کو برقرار رکھنے کا ذکر موجود ہے (۱۳/۳۹) یہ قانون نہ صرف عالمِ دین میں ہے، بلکہ عالمِ شخصی میں بھی

ہے، تاکہ علمی اور عرفانی ارتقاء میں کوئی تنگی نہ ہو (۲۲/۷۸)۔

جواب ۲: ذہن کا مطلب ہے سمجھنے کی دماغی قوت، اس کی کیفیت و حقیقت واضح کر دینے کے لئے ایک عمدہ مثال یہ ہے کہ دماغ اپنی مادّی ساخت میں گویا ایک صاف شفاف آئینہ ہے، رُوح بوسیلۂ عقل ایک سُورج ہے، اور ذہن اِس سُورج کی وہ روشنی ہے جو اس آئینے سے منعکس ہو جاتی ہے، اِسی معنیٰ میں ذہن نورِ رُوح کا عکس اور زندہ تصویر ہے، سو ذہن اور رُوح کے مابین یہی رشتہ قائم ہے۔

یہاں ذہن اور رُوح کے سوال میں عقل کا ذکر اس لئے آیا کہ انسانی رُوح میں ایک اساسی عقل پوشیدہ ہُوا کرتی ہے، جس کو "عقلِ غریزی" یعنی طبعی، فطری، اور اصلی عقل کہتے ہیں، جو ترقی پذیر ہونے کی وجہ سے حقیقی تعلیم کی محتاج رہتی ہے، اور دُوسری طرف سے عقل کے تصوّر کے بغیر ذہن کے کچھ معنی نہیں ہوتے ہیں۔

اَب رُوح اور ذہن کے درمیان جیسی وابستگی، جو تعلق، اور جیسا رشتہ ہے، اس کی مزید مثالیں عرض کی جاتی ہیں:۔

۱۔ ذہن رُوح کی پیداوار ہے، کیونکہ رُوح سے عقل ہے اور عقل سے ذہنیت بنتی ہے۔

۲۔ ذہن رُوح کا آلہ ہے، جس سے یہ (رُوح) احساس و ادراک کا کام لیتی ہے۔

۳۔ رُوح گویا چراغ کا تیل ہے، عقل جلتا ہُوا شعلہ ہے، اور ذہن وہ بکھر جانے والی روشنی ہے جو مکان میں ہر چیز کو چھُوتی ہُوئی منور کر دیتی ہے۔

۴۔ رُوح ایک عمدہ درخت ہے، عقل اس کی بلند شاخ، اور ذہن اس کا پھل ہے۔

۵۔ رُوح ایک صاف شفاف اور میٹھے پانی کا سرچشمہ ہے، عقل ایک خوبصورت نہر ہے، اور ذہن ایک زرخیز آبادی ہے۔

۶۔ رُوح ایک سلیقہ مند خاتون ہے، عقل ایک دانا مرد ہے، اور ذہن ایک ہونہار بچّہ ہے۔

۷۔ رُوح دوات ہے، عقل قلم ہے، اور ذہنیت تحریر ہے، پس ان تمام مثالوں سے رُوح اور ذہن کے مابین جو رشتہ اور تعلق ہے، اِس کی حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے۔

رُوح اور ذہن کا تعلق و رشتہ عقل کے توسّط سے قائم ہے، لہٰذا یہاں رُوح اور عقل کی باہمی وابستگی کی کچھ اور مثالیں بیان کی جاتی ہیں: پہلی مثال: اِنسان کی ہستی عالمِ صغیر ہے، جس میں رُوح کو حوّا کا اور عقل کو آدم کا مقام دیا گیا ہے، دُوسری مثال: رُوح اور عقل ایک طرح سے اِنسان کی خودی کے ماں باپ ہیں، یعنی رُوح ماں اور عقل باپ ہے، کیونکہ رُوح نمائندۂ اساسؑ اور عقل نمائندۂ ناطقؐ ہے، تیسری مثال: رُوح دلیلِ نفسِ کُلّی ہے، اور عقل دلیلِ عقلِ کُلّی ہے، چوتھی مثال: رُوح عالمِ شخصی (PERSONAL WORLD) کا چاند ہے، اور عقل اس کا سُورج، پانچویں مثال: رُوح حُجّت کی دلیل ہے، اور عقل امامؑ کی دلیل ہے، چھٹی مثال:

رُوح عالمِ شخصی کی ملکہ یا سُلطانہ (خاتونِ بادشاہ) ہے، اور عقل اس کی وزیرِ باتدبیر ہے، ساتویں مثال: رُوح ایک حکیم شخص ہے، اور عقل اس کا خوبصورت و پُروقار چہرہ ہے، پس ان جُملہ مثالوں سے رُوح اور عقل کے درمیان جیسا رشتہ ہے اس کی وضاحت ہوگئی، تاکہ اِس سے ذہن کو سمجھنے میں مدد مل سکے، کہ وہ کس طرح رُوح اور عقل کی منعکس (REFLECTED) روشنی ہے۔

اب سوال کا یہ حصّہ سامنے آتا ہے کہ حصُولِ علم کے سلسلے میں ذہن اور رُوح دونوں کا کیا وظیفہ یا عمل ہے؟ اس کا جواب یُوں عرض کرنا ہے کہ رُوح گویا ایک لطیف و ہوشمند رانی ہے، عقل ایک دانا بادشاہ کی طرح ہے، دماغ دارالسلطنت ہے، دل پادر ہاؤس اور برقی نظام ہے، یہاں دماغی قوتوں پر مشتمل ایک وزارت ہے، اور ذہن اس کی وزیرِ اعظم ہے، اور حواس ظاہر محکمۂ خبر رسانی کے مُلازم ہیں، جن کو خبر رسانی کے عجیب و غریب آلات سے لیس کیا گیا ہے، تاکہ یہ لوگ خارجی دُنیا کا علم اور معلومات دماغ کے مرکزی دفتر (ذہن) تک پہنچاتے رہیں، اِس مثال میں اِس امر کی پُوری طرح سے عکاسی ہوگئی، کہ رُوح اور عقل حصُولِ علم کا عمل کس طرح ذہن و حواس کے توسّط سے انجام دیتی ہیں۔

اگر سوال رُوحانی علم سے متعلق ہے، تو بڑی عاجزی سے عرض کروں گا کہ رُوحانی علم کے لئے ذہن و حواسِ ظاہر کا ہنگامی تعطّل اور خُود فراموشی ضروری ہے، اور یہ بابرکت کیفیّت جسے فنا بھی کہا جاتا ہے خصُوصی عبادت کے وسیلے سے اپنے اُوپر مسلّط کرلی جاتی ہے تاکہ پاک

رُوح (قدسی رُوح) معجزاتی علم کے لئے کام کر سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ عام انسانی رُوح اور ذہن کو حقیقی اطاعت، عبادت اور علم سے نفسِ مُطمئنّہ[1] کے درجے پر پہنچانا ہوتا ہے، دُوسرے لفظوں میں یُوں کہنا ہے کہ تیسری رُوح (انسانی رُوح) کو چوتھی رُوح (رُوحِ قدسی) میں فنا کر دینا پڑتا ہے، یہاں پر یہ عمدہ سوال بھی لازمی ہے کہ رُوحِ قدسی (پاک رُوح) میں پاکیزگی کا تصوّر کیوں ہے؟ اِس کے جواب میں عرض کی جاتی ہے کہ اس تصوّر کا سبب یہ ہے کہ دینِ اسلام میں پاکیزگی کی بہت بڑی اہمیت ہے، اور وہ تین قسم کی ہے: عقلی پاکیزگی، جو حقیقی علم سے ہوتی ہے، رُوحانی پاکیزگی، جو عبادت سے ہوتی ہے، اور جسمانی پاکیزگی، جو اطاعت (فرمانبرداری) سے ہوتی ہے، اور اطاعت کا مطلب ہر طرح کی فرمانبرداری ہے، جس کے بغیر جسم پاک نہیں ہو سکتا ہے۔

---

[1]: نفسِ مُطمئنّہ کا ذکر قُرآنِ پاک میں اِس طرح ہے: اے اطمینان یافتہ نفس (رُوح) اپنے پروردگار کی طرف رجُوع کر، درحالیکہ تُو اس سے راضی ہے (اور) وہ تجھ سے راضی ہے، سو میرے (خاص) بندوں میں داخل ہو جا اور میری بہشت میں داخل ہو جا (۸۹/۲۷-۳۰) رُوح کو اطمینان کب ملتا ہے؟ جب اِطاعت، عبادت اور علم کے فرائض ادا ہو جاتے ہیں، رجُوع کہاں کہاں ہوتا ہے؟ دُنیا میں اطمینان کی وجہ سے، اور آخرت میں موت کے سبب سے۔

جواب ۳ : یہاں سب سے پہلے یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ لامکان کیا ہے اور لازمان کا کیا مطلب ہے، تاکہ متعلقہ سوال کا جواب واضح ہو سکے، چنانچہ لامکان کے معنی ہیں بے جا، بے مکان (فارسی) وہ عالم (حالت) جو مکانی نہیں، جو جگہ اور اطراف سے مبرا ہے، یعنی روحانی اور عقلی عالم، جو مادی دنیا کے برعکس ہے، اور لازمان کے معنی ہیں غیر زمانی حالت، جو کائناتی یعنی عالم جسمانی کے زمان سے برتر ہے، یعنی نہ گزرنے والا اور ٹھہرا ہوا زمان جسے دہر کہا جاتا ہے (۲۶/۱)۔

اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے اس مادی عالم کو بھول جائیں یا ایسا تصور کریں کہ ہم اس سے باہر جا چکے ہیں یا فرض کریں کہ نیست و نابود ہو چکا ہے، تو اس حال میں یہ لامکان اور لازمان کا ایک تصور ہوگا، کیونکہ جب مکان (جگہ) ختم ہو گیا، تو منطقی طور پر نہ صرف لامکان ہو گیا، بلکہ اسی کے ساتھ ساتھ یہ لازمان بھی ہو گیا، جبکہ زمان نام ہے مکان (کائنات) کی گردش کا یعنی اگر آسمان، سورج، اور زمین نہیں تو زمان بھی نہیں، ہاں اس حال میں نہ ٹلنے والا زمان ہوگا، جس کا نام دہر ہے۔

عالم باطن یا لامکان کے دو درجے ہیں، وہ درجۂ روح اور درجۂ عقل ہیں، اسی طرح اس دنیا میں لامکان کی دو مثالیں ہیں: عالم خیال اور عالم خواب، یہ دونوں مثالیں ایسی کافی وافی ہیں کہ اگر ہم ان میں خوب غور کریں تو لامکان و لازمان کے بارے میں بہت کچھ سمجھ سکتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ سفر لامکان کی تشبیہہ یا تو خیال سے دی جاتی ہے یا خواب

سے، مثال کے طور پر ایک آدمی آنکھیں بند کر کے گم صم دنیائے خیال میں داخل ہوگیا، اس کا خیال گویا لذت و دلکشی کا ایک سمندر تھا، اس لئے وہ اس میں ڈوب کر گہرائی میں چلا گیا، وہ اب جسم سے اس مادی دنیا میں موجود ہونے کے باوصف شعوری طور پر لامکان میں پہنچ گیا ہے، کیونکہ ظاہری دنیا کو بھول جانا ہی لامکان کو جانا ہے، اب وہ خیال ہی خیال میں ایک ایک کر کے زمانۂ ماضی کے واقعات کو اس طرح دیکھتا ہے جیسے اُن پر کوئی وقت ہی نہیں گزرا ہو، ہر چند کہ غیر ترقی یافتہ خیال صبح کاذب کی طرح دُھندلا سا ہوتا ہے، تاہم اس میں ایک طرح سے آسمان اور زمین کی تمام چیزیں دکھائی دیتی ہیں، یہ مثال ایک عام خیال سے متعلق ہے، اور اگر خیال کو اخلاقی، مذہبی اور رُوحانی تربیت دی جائے تو یہ صرف مثال نہیں بلکہ خود لامکان بھی بن سکتا ہے پس سفرِ لامکان اور واپسی کی مثال یُوں ہے جیسے کسی کا ایک پُرکشش اور گہرا خیال ہوتا ہے، جس میں وہ شخص چُپ چاپ رفتہ رفتہ ڈوب جاتا ہے اور کچھ وقت کے بعد چونک جاتا ہے۔

لامکان کی دُوسری مثال عالمِ خواب ہے، انسان کے نیند بھر کر سو جانے کے ساتھ ساتھ حواسِ ظاہر کا چراغ کم سے کم تر ہوتا ہوا بجھ جاتا ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ رُوح کی توجہات اس طرف آنے کی بجائے کسی اور جانب مرکوز ہو جاتی ہیں، یہی عالمِ خواب کا سفر ہے، لیکن بہت ہی مختصر ہے، اور لامکان کا سفر بھی اسی کے مُشابہ ہے، مگر یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ انسان کے نہ صرف خیال کی ترقی ہو سکتی ہے بلکہ خواب کی بھی بہت

کچھ اصلاح ہو سکتی ہے تا آنکہ خیال اور خواب دونوں رُوحانیت میں مدغم ہو جاتے ہیں، اور عام حالت میں عالمِ خواب کے لامکان کی مثال ہونے کی دلیل یہ ہے کہ خواب میں جو چیزیں دکھائی دیتی ہیں، وہ غیر مادّی، لامکانی اور لازمانی ہُوا کرتی ہیں؛ جیسے اگر کوئی شخص خواب میں کچھ کھاتا ہے تو اس کا پیٹ نہیں بھرتا، وجہ ظاہر ہے کہ وہاں مادّی اشیا نہیں، وہ عالم اس بات کا بھی پابند نہیں کہ اگر دُنیائے ظاہر میں موسمِ خزاں ہے تو اس میں بھی خزاں ہو، ہرگز ایسا نہیں، کیونکہ عالمِ خواب اپنی ذات اور خاصیّت میں لامکان اور گوناگون چیزوں کے ظہورات کا سرچشمہ ہے، اور اِس کا ایسا ہونا معجزاتِ خُداوندی میں سے ہے، جیسا کہ قرآنِ کریم میں فرمایا گیا ہے :-

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ (۳۰/۲۳)

اور اس کی نشانیوں میں سے تمہارا دن کا اور رات کا خواب ہے اور اس کے فضل سے تمہارا (رُوحانی رزق) چاہنا ہے، یقیناً اِس میں (گوشِ ہوش سے) سُننے والوں کے لئے نشانیاں (معجزات) ہیں۔ اِس آیۂ کریمہ کی تاویل بعد میں بیان کریں گے، اور یہاں بمقامِ تنزیل منام کے معنی خواب بالکل درست ہیں، کہ وہ (خواب) عجائب و غرائبِ قدرت میں سے ہیں۔

آیۂ مذکورۂ بالا میں لفظ "منام" بڑا پُر حکمت ہے، اِس کے معنی

سونے اور خواب کے ہیں، اور اس کی تاویل بذریعۂ ذکر و عبادت عالمِ رُوحانیت یا لامکان میں داخل ہونے کی ہے، کیونکہ دروازۂ رُوحانیت کی ایک کیفیت سو جانے یعنی نیند طاری ہو جانے کی طرح ہے، جیسا کہ اِس سے پہلے حواسِ ظاہر کو سُلا کر حواسِ باطن کو جگانے کے ضمن میں ذکر ہو چکا ہے، چنانچہ آیت کی پوری تاویل یہ ہے :-

اور تمہاری دن رات کی رُوحانیت (منام)، جو نیند آنے اور خواب دیکھنے کی طرح ہے، اور اس میں تمہاری علم و حکمت کی تلاش اور اس کے نتائج، بالیقین اس میں گوشِ حقیقت سے سُننے والوں کے لئے معجزات ہی معجزات ہیں۔ اِس سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ رُوحانیت یعنی لامکانی اور لازمانی حدّ میں داخل ہو جانے کی کیفیت نیند کی طرح ہے، اور پھر اس سے واپس آنے کی حالت خواب سے جاگنے کی طرح ہے۔

یہ ارشادِ مبارک بھی اِسی سلسلے کا ہے :-

ثُمَّ اَنزَلَ عَلَيكُم مِّن بَعدِ الغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغشٰى طَآئِفَةً مِّنكُم (۳/۱۵۴)

پھر خُدا نے تم پر اس کے بعد کہ تم غمگین ہوتے تھے اطمینان کی حالت طاری کر دی یہ ایک نیند میں تھی جو تم میں سے ایک گروہ کو ڈھانپ لیتی تھی۔ یہ جنگِ احد کی شکست تھی، جس میں خاص مومنین نے خوف و ہراس اور غم کے درمیان رہتے ہوئے کثرت سے خُدا کو یاد کیا تھا، لہٰذا نتیجہ رُوحانیت کی صورت میں سامنے آیا، یعنی اُن پر معجزاتی نیند مسلط کر دی گئی،

جو رُوحانیت کو اپنے ساتھ لاتی ہے، ورنہ خوابِ غفلت کی کوئی ایسی تعریف نہیں ہو سکتی ہے۔

فرمانِ خُداوندی ہے :-

اِذ یُغشّیکُمُ النعاس امنۃً مِنہُ وینزل علیکُم من السّماء ماءً لیطھّرکم بہٖ ویذھب عنکُم رجز الشیطان ولیربط علیٰ قلوبکم ویثبّت بہ الاقدام (۸/۱۱)

اور وہ وقت جب کہ خُدا اپنی طرف سے غنودگی کی شکل میں تُم پر اطمینان و بے خوفی کی کیفیّت طاری کر رہا تھا، اور آسمان سے تمہارے اوپر پانی برسا رہا تھا تاکہ تمہیں پاک کرے اور تُم سے شیطان کی ڈالی ہوئی نجاست دُور کرے اور تمہاری ہمّت بندھائے اور اس کے ذریعے سے تمہارے قدم جما دے۔ یہاں بھی "نُعاس" خوابِ پُر حکمت ہے، یعنی رُوحانیت پانی علم ہے، نجاست شک اور وسوسہ ہے، ربط اسمِ اعظم کا دِل میں جم جانا ہے، اور ثابت قدمی لغزش کے بغیر ذکر میں آگے بڑھ جانا ہے، یاد رہے کہ حقیقی مومنین کی یہ رُوحانیت جنگِ بدر سے متعلّق ہے، اِس کا مقصد ایک تو یہ بتانا ہے کہ جہاد جیسے پُر خطر دینی اُمور کی انجام دہی سے رُوحانی ترقّی ہوتی ہے، دُوسرا یہ کہ قرآنِ حکیم میں رُوحانیت کی تشبیہ نیند سے دی گئی ہے، اور تیسرا یہ کہ نیند حواسِ ظاہر کو معطّل کر دیتی ہے جس سے لامکان کے ساتھ رابطہ قائم ہو جاتا ہے۔

جب انفرادی قیامت اور رُوحانیت گنجِ گوہرِ مکنون تک پہنچ جاتی ہے، تو اُس وقت مرتبۂ عقل کا "لامکان" سامنے ہوتا ہے، کیونکہ اُس حال میں عقلی طور پر مکان و زمان کا تصوّر ختم ہو کر ازلی و ابدی حقائق و معارف کے ظہورات کا آغاز ہو جاتا ہے، جبکہ ساری کائنات قبضۂ قدرت میں لپیٹی ہوئی ہوتی ہے، جیساکہ ترجمۂ آیۂ کریمہ ہے :-

وہ دن جب کہ آسمان کو ہم یُوں لپیٹ لیں گے جیسے طومار میں اوراق لپیٹ لئے جاتے ہیں۔ جس طرح پہلے ہم نے تخلیق کی ابتداء کی تھی اسی طرح ہم پھر اس کا اعادہ کریں گے۔ یہ ایک وعدہ ہے ہمارے ذِمّے، اور یہ کام ہمیں بہرحال کرنا ہے (۲۱/۱۰۴) اِسی موضوع کا دُوسرا ارشاد یہ ہے : قیامت کے روز پُوری زمین اس کی مُٹھی میں ہو گی اور آسمان اس کے دستِ راست میں لپٹے ہُوئے ہوں گے (۳۹/۶۷)۔

۱۔ یہ دونوں بابرکت اور پُرحکمت آیتیں بُنیادی اور آخری حقائق کے تصوّر کے لئے خاص ہیں، جیسے ازل، ابد، امر، خلق، بقا، فنا، لامکان، مکان، لازمان، زمان، نُور، عرش، قلم، گنجِ مخفی، علّیین، امامت، وغیرہ

۲۔ ایک اعتبار سے یہ مادّی کائنات کا ذکر ہے اور دُوسرے اعتبار سے علمی کائنات کا۔

۳۔ قرآنِ حکیم میں عرشِ رحمان کا تصوّر اِس کائنات سے اوّل بھی ہے اور آخر بھی، اور وہ تصوّر یہی ہے۔

۴۔ یہ قلمِ الٰہی کا تصوّر ہے، جو علمِ سماوی کا سرچشمہ ہے۔

۵۔ گنجِ مخفی یعنی اسرارِ معرفت کا خزانہ یہی ہے۔

۶۔ اِنسان کا رُوحانی اور علمی سفر ایک دائرے پر واقع ہے، جس پر وہ ازل سے چلنے لگا تھا، پھر وہ گھوم کر ازل ہی میں جا پہنچتا ہے، اور ابد اسی مقام کا دُوسرا نام ہے۔

۷۔ یہ تصوّر کتابِ مکنون کا ہے، جس میں قرآنِ کریم ہے۔

۸۔ اِس تصوّر میں اُس عظیم فرشتے کا ذکر ہے، جو حاملِ عرش ہے، جس کے ہاتھ میں نگینۂ حکمت ہے۔

۹۔ نُورِ توحید کا مشرق و مغرب ایک ہی جگہ ہے۔

۱۰۔ یہ تصوّر خُدا کی بادشاہی کو ظاہر کرتا ہے۔

۱۱۔ ایک بلند ترین مثال ہے، جو تمام مثالوں پر محیط ہے، اس کا تصوّر یہ ہے۔

۱۲۔ وہ پہاڑ جس پر اگر قرآن نازل ہوتا تو وہ ریزہ ریزہ ہو جاتا، یہ ہے۔

۱۳۔ وہ حجرِ ابیض جس کی مثال حجرِ اسود ہے، یہ ہے۔

۱۴۔ وہ پہاڑ جو جلوۂ خُداوندی سے ریزہ ریزہ ہو گیا تھا، یہ ہے۔

۱۵۔ یہ وہ لُؤلُؤ اور مرجان ہے، جس کا قرآنِ پاک میں ذکر فرمایا گیا ہے۔

۱۶۔ یہ وہ پتھر ہے جس کے گرنے سے علم کا پانی نکلتا ہے۔

۱۷۔ اسی مقام پر چشمۂ سلسبیل ہے۔

۱۸۔ اسی میں یدِ بیضا کا معجزہ ہے۔

۱۹۔ عقلی اور علمی فنا کا مقام یہیں ہے۔

۲۰۔ یہی نور، مشکات، مصباح، زجاجہ اور کوکبِ دُرّی ہے۔

۲۱۔ یہیں زیتون کا مبارک درخت ہے، جو شرقی بھی نہیں اور غربی بھی نہیں، کیونکہ وہ لامکانی ہے۔

۲۲۔ نورِ سامنے کی طرف اور دستِ راست کی طرف اسی مقام پر ہے۔

۲۳۔ نورِ تمام کا تصور یہی ہے۔

۲۴۔ کتابِ مُنیر یہی ہے۔

۲۵۔ کوہِ قافِ علم یہی ہے۔

۲۶۔ علیین یہی ہے۔

۲۷۔ تسبیح و تقدیس کا اصل مقام یہی ہے۔

۲۸۔ اور کشتیٔ علم و حکمت یہی ہے۔

نصیر الدین نصیر ہونزائی
خانۂ حکمت کراچی
مورخہ ۲۴ اگست ۱۹۸۴ء ادارۂ عارف کراچی

صمصامِ علمی

(بیس ۲۰ حکمت)

"صمصام" ایک عربی لفظ ہے، جس کے معنی ہیں شمشیرِ بُرّان، تیز تلوار، نہ مُڑنے والی تلوار، اور یہ بعض روایات کے مطابق حضرت مولا علی صلوات اللہ علیہ کی ایک تلوار کا نام ہے۔

"صام صام" آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے اسمائے مُبارک میں سے ایک اسم ہے، جو حضرتِ شیث علیہ السّلام کے صُحُف میں مذکور تھا، اور صام صام کے معنی یہاں تلوار کی مثال پر "قطّاع بالحُجّۃ" ہیں، یعنی دلیل و بُرہان کی تلوار سے کاٹنے والا، بمعنی فیصلہ کرنے والا، جس سے صمصامِ علمی (علم کی تیز تلوار) مُراد ہے، یعنی علمِ حقیقت کی شمشیر، جس طرح حدیثِ شریف میں حق و حقیقت کی تشبیہ تیز تلوار سے دی گئی ہے، اُس ارشاد کا ترجمہ یہ ہے: "حق خُدا کی تلوار ہے، جب بھی کسی چیز پر ماری جاتی ہے تو اس کو کاٹے بغیر نہیں چھوڑتی"۔ اب یہاں اِسی مناسبت سے

علم و حکمت کی کچھ باتیں بتائی جاتی ہیں :-

۱- پیغمبرِ اسلامؐ نے حدیثِ خاصفُ النّعل میں جس طرح جہاد کا تصوّر پیش کیا ہے، اس سے صاف طور پر یہ ظاہر ہے کہ اسلام میں جہاد دُہرا ہے، یعنی جہادِ تنزیلی اور جہادِ تاویل، تنزیلی جہاد کے مالک و سردار حضور اکرمؐ تھے، اور تاویلی جہاد کے لئے خُدا اور رسُولؐ نے امیر المومنین مولا علیؑ کو مقرّر فرمایا تھا، کہ آپؑ ولیِّ امر تھے، اور یہاں مولا علیؑ سے پُورا سلسلۂ امامت مُراد ہے، کیونکہ تاویلی جنگ ظاہراً و باطناً پُورے دَور پر پھیلی ہُوئی ہے۔

۲- مذکورۂ بالا حدیثِ شریف کی روشنی میں دیکھنے سے کئی حقیقتیں سامنے آتی ہیں، مثال کے طور پر یہ کہ اسلام میں ایک دعوت کے بعد دُوسری دعوت ہے، کیونکہ اسلام صراطِ مستقیم ہے اور صراطِ مُستقیم قدم بہ قدم اور منزل بہ منزل آگے بڑھنے کے لئے ہے، نیز یہ کہ لوہے کی ذُوالفقار ظاہری جنگ کے لئے تھی، اور علم کی ذُوالفقار یا صمصام باطنی اور علمی جہاد کے لئے مُقرّر ہے، جس میں امامِ عالی مقامؑ خُدائی لشکر کے سردار ہیں، اور مومنین اِس علمی جہاد میں لشکر کے مختلف فرائض انجام دے رہے ہیں، اِس جنگ کے دو میدان ہیں : مقامِ رُوحانیت اور مقامِ جسمانیت، جس کے لئے خُدائی لشکر کے دو حصّے ہیں : آسمانی لشکر، جس سے ارواحِ مومنین مُراد ہیں، اور زمینی لشکر، جس کا مطلب ہے مومنین کی شخصیتیں (۴۸/۷،۴)۔

۳- دینِ اسلام کے حقیقی علم میں کیا اثر ہے اور دلائل کی شمشیریں

کس حد تک کام کر سکتی ہیں، اِس کا دُرست اندازہ اِس آیۂ کریمہ سے ہو سکتا ہے ارشاد ہے کہ: "لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ (۸/۴۲) تاکہ وہ شخص ہلاک ہو جو دلیل سے ہلاک ہو چکا ہے اور وہ شخص زندہ ہو جائے جو دلیل سے زندہ ہو چکا ہے"۔ یعنی جو آدمی قانونِ عقل کے نزدیک بحدِ قوت مر چکا ہو تو اُسکی جسمانی زندگی بیکار ہے، لہٰذا اُسے فعلاً ہلاک ہو جانا چاہیئے، اور جو اس قانون کے مطابق بحدِ قوت زندہ ہو چکا ہو تو اُسے فعلاً زندہ ہو جانا چاہیئے۔ اور یہاں یہ بھی یاد رہے کہ دلائل اِسلام کی جان ہادیٔ برحق ہوا کرتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ بموجب قرآن رسولِ خدا کا ایک نام "البیّنہ" بھی ہے یعنی دلیل جس سے پیغمبر اور امامؑ مُراد ہیں۔

۴۔ قرآنِ حکیم کے پُر حکمت الفاظ میں سے ایک بہت پیارا لفظ "سُلطان" ہے، جو قرآنِ پاک میں ۳۷ دفعہ مذکور ہے، جس کے معنی ہیں دلیل، حُجّت، اقتدار، غلبہ، زور اور بادشاہ، اور اس کی تاویل ہے امامِ زمان علیہ السّلام، کیونکہ آپؑ ہی جانشینِ رسُول ہیں، جو زمانۂ نبوّت میں دلیلِ روشن (البیّنہ ۹۸/۱) تھے، جیسا کہ خُداوندِ عالم کا ارشاد ہے:-

"اے گروہِ جنّ و اِنس اگر تُم سے ہو سکے کہ آسمانوں اور زمین کے کناروں سے نکل جاؤ تو نکل جاؤ، تُم نہ نکل سکو گے، مگر دلیل (سلطان) سے (۵۵/۳۳)" یعنی رُوحانی اور علمی طور پر عالمِ مادّیت سے نجات حاصل کر کے عالمِ علوی اور لامکان میں پہنچ جانا جنّات اور اِنسانوں کے بس کی بات نہیں، مگر ہاں، امامِ وقت کے وسیلے سے یہ بات ممکن ہے، کیونکہ

آپؑ ہی تمام معنوں میں سُلطان ہیں۔

۵۔ اس آیۂ کریمہ میں خوب غور کیجئے: "اِنَّ عِبادی لَیس لک علیھم سُلطٰنٌ اِلّا من اتّبعک من الغٰوین (۱۵/۴۲) جو ہمارے بندے ہیں، اُن پر تو تیرا زور نہیں چلے گا، ہاں گمراہوں میں سے جو کوئی تیرے پیچھے ہولے (تو ہولے)" اِس کا مطلب یہ ہے کہ جب مومنین کے پاس اللہ تعالیٰ کی قوّت (سُلطان یعنی امامِ زمانؑ) موجُود ہے، تو شیطان ان کو گمراہ نہیں کر سکتا ہے، لیکن شیطان ایسے لوگوں میں سے کسی کو اپنا پیرو بنا سکتا ہے، جو صراطِ مُستقیم، ہادیٔ برحق اور ہدایت سے الگ ہو چکا ہو، کیونکہ اب اس کے پاس حقیقی سُلطان نہیں، تو ظاہر ہے کہ شیطان اُس پر غلبہ پائے گا۔

۶۔ جملہ باطل پیشواؤں کو قرآنِ حکیم نے اصنام قرار دیا ہے، کیونکہ جس طرح بُت کو لوگ ہی تراشتے ہیں، اِسی طرح یہ پیشوا لوگوں کی طرف سے مقرّر ہیں، خُدا کی جانب سے نہیں، اور ایسے باطل پیشواؤں کے نام بھی لوگوں نے رکھے ہیں، جیسے پیر، مُرشد، امام وغیرہ، حالانکہ اس کے بارے میں خُداوندِ عالم نے کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی ہے، اور اِس کے برعکس ائمۂ ھُدا کی حمایت میں خُداوند تعالیٰ نے دلیل نازل کی ہے اور یہ دلیل یعنی سُلطان ائمۂ طاہرین صلوات اللہ علیہم السّلام کے حق میں اپنے تمام اعلیٰ معنوں کے ساتھ ہے۔

۷۔ اِس سے بڑھ کر تکمیلِ دین اور اتمامِ نعمت کی کوئی دلیل ہی

نہیں کہ پیغمبر برحق کے بعد امام عالی صفات کی مبارک ہستی ہمیشہ دُنیا میں موجود و حاضر ہو، جیسے حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کے بارے میں فرمایا گیا ہے: پھر ہم نے موسیٰؑ اور ان کے بھائی ہارونؑ کو اپنی نشانیوں اور دلیلِ ظاہر کے ساتھ فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف بھیجا (۲۳/۴۵-۴۶) قرآن حکیم کی کئی آیاتِ کریمہ میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کی نظیر پیش کرنے کا خاص مقصد نبوّت و امامت کی باہمی وابستگی کو ظاہر کرنا ہے، اور یہاں دلیل سے علم و حکمت مُراد ہے اور تنزیل کے بعد تاویل، جو حسّی معجزات سے بڑھ کر ہے۔

۸۔ عرض کی گئی ہے کہ جہاد دو قسم کا ہے: جسمانی اور علمی، تلوار کی بھی دو قسمیں ہیں: آہنی اور علمی، ہجرت بھی دو طرح سے ہے: ظاہری اور باطنی، ظاہری ہجرت یہ ہے کہ بوقتِ ضرورت اپنے گھر اور وطنِ مالوف کو دین کی خاطر چھوڑ دیا جائے، اور باطنی ہجرت یہ ہے کہ دین کو تقویت دینے کے لئے جسمانیت سے رُوحانیت کی طرف سفر کیا جائے، چنانچہ اِس تعلیمِ ربّانی میں ایسی دو دو صُورتوں کا ذکر موجود ہے: "جو لوگ ایمان لائے اور اُنہوں نے (ظاہری یا باطنی) ہجرت کی اور اپنے (مادی یا علمی) مال اور جان کے ساتھ راہِ خُدا میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے جگہ دی اور مدد کی، تو یہی لوگ ایک دُوسرے کے وارث (اور دوست) ہیں۔"

۹۔ یہ سُورۂ عنکبوت (۲۹) کی آخری آیت کا مفہوم ہے: "جو لوگ دینِ خُدا کے کام میں جہاد جیسے کارنامے انجام دیتے ہیں تو خُدا بھی ان کو اپنے علم و عرفان کے رستے دکھائے گا، اور کچھ شک نہیں کہ خُدا

نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

۱۰- قرآن کریم میں حقیقی علم کی اہمیت و ضرورت اور اس کی فضیلت و مرتبت کا ذکر کثرت سے فرمایا گیا ہے، اور اعلیٰ سے اعلیٰ حقائق کو جاننے کا حکم دے کر یہ ثابت کیا گیا ہے کہ علم کی اِنتہائی بلندی تک پہنچ جانا ممکن ہے، مثال کے لئے ملاحظہ ہو: "وَاعْلَمُوا اَنَّ اللّٰہَ یَحُوْلُ بَیْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِہٖ وَاَنَّہٗ اِلَیْہِ تُحْشَرُوْنَ (۸/۲۴) اور (یہ راز) جان لو کہ اللہ تعالیٰ آدمی اور اس کے قلب کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور یہ بھی جان لو کہ تم سب اسی کے پاس حاضر کئے جاؤ گے۔" اِس پُر حکمت تصوّر نے آدمی کے اِس دل کو نہیں جو گوشت کا لوتھڑا ہے بلکہ حقیقی دل کو جسم سے الگ دکھایا ہے، اور وہ قلب یقیناً امامِ اقدس و اطہر ہیں، جو مومن کا حقیقی دل اور اناتے علوی ہیں، جسے آج نہیں تو کل حاصل کرنا ہی ہے۔

۱۱- آیۂ مذکورۂ بالا میں لفظ "قلب" جو امام کے لئے آیا ہے، اس کے کئی معنی ہیں، جیسے القلب: دل، عقل، رُوح، لشکر کا وسط، ہر چیز کا خلاصہ یا جوہر، خالص نسب والا یعنی اصیل آدمی، وَقیل سُمّیَ القلب قلباً لِتَقَلُّبِہٖ: کہا جاتا ہے کہ دل کو قلب کا نام پلٹنے کے معنی میں دیا گیا ہے، چُنانچہ یہ تمام معانی امامِ پاک کے لئے دُرست ہیں، کیونکہ امام ساری کائنات کی عقل و جان ہیں، آپؑ ہر مومن کی حقیقی عقل اور رُوح ہیں، خُدائی لشکر کا وسط اور ہر چیز کا خلاصہ ہیں، ہر طرح سے اصیل ہیں اور آپؑ ساری کائنات میں بذریعۂ جُنبۂ ابداع

سیر کرتے ہیں، اِس لئے آپ کے تاویلی ناموں میں سے ایک قلب ہے۔

۱۲۔ قرآن مقدس میں جتنی مثالیں بیان ہوئی ہیں، اُن سب کا ایک ہی اصُول اور ایک ہی مقصد ہے، آپ اِس مطلب کو اس آیۃ کریمہ میں سمجھ سکتے ہیں: "وَتلكَ الامثالُ نَضرِبها لِلناسِ وَمَا يعقلها إلّا العالمون (۲۹/۴۳) اور ہم یہ مثالیں لوگوں کے (سمجھانے کے) لئے بیان فرماتے ہیں اور علماء ہی انکو سمجھتے ہیں۔" اِس آیت میں آپ واضح طور پر دیکھ رہے ہیں کہ جو مثالیں لوگوں کے سمجھانے کی غرض سے بیان کی گئی ہیں، ان کو لوگ اپنے آپ نہیں سمجھ رہے ہیں، کیونکہ مثالیں تو متشابہات میں سے ہُوا کرتی ہیں، لہٰذا اس میں ایسے علماء سے رجُوع کرنے کا اشارہ ہے، جو مثال کے ممثول یعنی تاویل کو جانتے ہیں، اور وہ علماء صرف حضرات ائمۂ طاہرین صلوات اللہ علیہم ہیں، اِس سے کئی حکمتوں پر روشنی پڑتی ہے، پہلی حکمت یہ کہ تمام اُونچی حقیقتیں جو لوگوں کی عقل سے بالاتر ہیں مثالوں میں بیان ہوتی ہیں، دُوسری یہ کہ مثالوں کو سمجھنے کے لئے امامِ وقت سے رجُوع لازمی ہے، تیسری یہ کہ قرآن کی ساری مثالیں اِسی قانُون کے تحت آتی ہیں، چوتھی یہ کہ جب تک قرآن دُنیا میں باقی ہے اور جب تک لوگوں کو اس کے تاویلی اسرار سمجھنے کی ضرورت ہے، تب تک سلسلۂ امامت قائم اور جاری ہے، اور پانچویں یہ کہ یہ علماء وہی حضرات ہیں جن کو خُدا نے مقامِ تاویل پر راسخون فی العلم (۳/۷) کے لقب سے نوازا ہے۔

۱۳۔ عرش کی سب سے خاص تاویل نُورِ عقل ہے، چنانچہ حاملِ نُور

یعنی امام زمانؑ اپنے وقت میں وہ اکیلا عظیم فرشتہ ہیں، جو عرشِ الٰہی کو اُٹھا رہے ہیں، مگر آیۂ کریمہ میں بظاہر ایسا لگتا ہے، جیسے کئی عظیم فرشتے مل کر عرش کو اُٹھا رہے ہوں، جس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں جو صیغۂ جمع (اور اُس دن تمہارے پروردگار کے تخت کو آٹھ (فرشتے) اپنے اُوپر اُٹھائے ہوں گے ۶۹/۱۷) آیا ہے، وہ ترتیب اور سلسلے سے متعلق ہے، یعنی ہر سات امام اپنے اپنے وقت میں عرشِ نور کو اُٹھاتے ہیں، اور ہر امام ہفتم کے بعد ایک خلیفہ ہُوا کرتا ہے، اِسی طرح آٹھ فرشتے ہوتے ہیں۔

۱۴۳۔ حضرت مُوسیٰؑ نے التجا کی کہ "اے ربّ! مجھے یارائے نظر دے کہ مَیں تجھے دیکھوں۔" فرمایا "تُو مجھے نہیں دیکھ سکتا، ہاں ذرا سامنے کے پہاڑ کی طرف دیکھ، اگر وہ اپنی جگہ قائم رہ جائے تو البتہ تُو مجھے دیکھ سکے گا۔" چُنانچہ اس کے ربّ نے جب پہاڑ پر تجلّی کی تو اسے گرا کر ریزہ ریزہ کر دیا اور مُوسیٰ غش کھا کر گر پڑا (۷/۱۴۳)

اِس آیۂ کریمہ کی عظیم تاویلی حکمت کی غرض سے یہ سوال کرنا مناسب ہے کہ اگر یہ پہاڑ ظاہری اور مادّی قسم کا تھا تو بے جان اور بے عقل پہاڑ نے نُورِ تجلّی کے اثر کو کیسے قبول کیا، اور کس معنیٰ میں یا کس طرح گر کر ریزہ ریزہ ہو گیا؟ اِس کے بارے میں گذارش یہ ہے کہ حضرت مُوسیٰؑ کے سامنے ظاہراً و باطناً دو پہاڑ تھے، ایک مادّی اور دُوسرا رُوحانی اور عقلی، اور پروردگار نے اپنی تجلّی کو عقل پر عقلی اور علمی صورت میں ڈالی تھی، اور کسی دُوسری طرح سے نہیں، کیونکہ قرآنِ حکیم

میں جہاں ربّ (پروردگار) کا اسم آتا ہے، وہاں لازماً عقلی اور علمی پرورش کی کوئی بات ہوتی ہے، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی رُوحانیّت کے اس بلندترین درجے میں ربّ کریم نے اپنے حکمت آگین نورانی ظہور سے عقل کے پہاڑ کا عقلی اور علمی تجزیہ فرمایا، اور اسرارِ عظیم کے جواہر بکھیر دیئے، حضرت موسیٰؑ کے بیہوش ہوکر گر جانے کی تاویل یہ ہے کہ آپؑ کو اس انتہائی عظیم، بمثال اور جامع الجوامع مظاہرۂ علم و حکمت سے سخت حیرت ہوئی، اور ہوش میں آنے کی یہ تاویل ہے کہ پھر آپؑ رفتہ رفتہ سرچشمۂ نورِ عقل کی حکمتوں کو اخذ کرنے لگے۔

۱۵- اِس حقیقت میں کوئی شک نہیں کہ سُورۂ فاتحہ بمقامِ ظاہر اُمّ الکتاب (کتاب کی ماں) ہے، اور اساس یعنی مرتضیٰ علیؑ بمقامِ باطن اُمّ الکتاب ہیں (۴۳/۴) ، کیونکہ آپؑ بہرۂ خُدا اور بحرِ گوہرزا" (۵۵/۲۷) ہیں، ہاں یہ دُرِّ مکنُون ہی کتابِ مکنُون ہے اور یہ پاک سمندر موتیوں کی ماں (۵۶/۷۸)۔

۱۶- ظاہری اور باطنی جہاد پیغمبرؑ اور امامؑ کے ذریعے سے انجام پاتا ہے، آپ اس کی مثال قصّۂ طالوتؑ (۲/۲۴۶-۲۵۱) میں دیکھ سکتے ہیں، طالوت علیہ السّلام امام تھے، جیساکہ فرمایا گیا ہے: " قال اِنّ اللّٰہ اصطفٰہُ علیکم وزادہٗ بسطۃً فی العلمِ والجسمِ ط واللّٰہُ یؤتی مُلکہٗ من یشآء ط واللّٰہ واسعٌ علیم (۲/۲۴۷) پیغمبر نے کہا کہ اللہ نے تم پر (حکم رانی کے لئے) اِسی کو برگزیدہ کیا ہے

اور علم اور جسم میں اس کو (بڑی) فراخی دی ہے اور اللہ اپنی بادشاہی جس کو چاہے عطا کرتا ہے اور اللہ (بڑی) گنجائش والا اور جاننے والا ہے"۔ یہاں لفظ "زَادَہٗ" میں دُہری حکمت پوشیدہ ہے، ایک تو یہ کہ امامِ برحقؑ دُنیا بھر کے لوگوں کے مقابلے میں زیادہ ہیں، کیونکہ آپؑ کے پاس رُوحانی علم اور ابداعی جسم ہے، اور دُوسری حکمت یہ کہ آپؑ پہلی حالت کے مُقابلے میں دُوسری حالت میں زیادہ ہُوا کرتے ہیں، جبکہ ان کو خُدا کی طرف سے ظاہری علم کے ساتھ باطنی علم اور کثیف جسم کے ساتھ لطیف جسم ملتا ہے۔

۱۷۔ اِس قِصّہ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ خُدا نے طالوت کو بادشاہ مقرّر کیا (۲/۲۴۷) اِس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ طالوتؑ امام تھے، کیونکہ خُدا کے دین میں دُنیوی قسم کی بادشاہی کا کوئی تصوّر نہیں، مگر دینی بادشاہی ضرور ہے، جو نبوّت کی صورت میں یا امامت کی شکل میں ہُوا کرتی ہے، اور یہ بادشاہی دراصل اللہ تعالیٰ کی ہے، وہ جسے چاہے عطا کر دیتا ہے، اور بقولِ قرآن (۴/۵۴) یہی اس کی مرضی تھی کہ یہ دینی اور رُوحانی بادشاہی آلِ ابراہیمؑ اور آلِ محمّدؐ میں جاری و باقی رہے۔

۱۸۔ اہلِ دانش کے نزدیک یہ ایک مُسلّمہ حقیقت ہے کہ خُدا کی ساری خُدائی اُس شخص کی حمایت میں کام کرتی ہے، جس کو خُدا و رسُولؐ نے مسندِ دین پر بٹھایا ہے، اور ایسا بادشاہ امامِ زمان صلوات اللہ علیہ ہیں، جن کے لئے بحکمِ خُدا آسمان و زمین کی ہر چیز غلامی کرتی ہے، اِس سلطنت کے بارے میں جو اقرار کیا جاتا ہے وہ تو اقرار ہی ہے،

اور جو انکار ہے وہ بھی خالی از حکمت نہیں، آخر طاقت و حرکت پیدا کرنے کے مُثبت (POSITIVE) کے ساتھ ساتھ منفی (NEGATIVE) بھی چاہیئے، اور قدرت و فطرت کا قانون یہی ہے۔

۱۹- کوئی شخص کسی بھی معیار سے امام کو نہیں پرکھ سکتا، اور آزما نہیں سکتا، کیونکہ امامؑ بادشاہ ہیں، لہٰذا قانونِ معیار سازی اِنہی کے ہاتھ میں ہے، تاکہ جگہ اور وقت کے مطابق کوئی کسوٹی بنا کر لوگوں کو آزمایا کریں، جس میں لوگوں کا فائدہ ہے، چنانچہ بطورِ آزمائش امام سے معجزہ یا کرامت طلب کرنا خطا ہے، ہر چند کہ امامِ زمانؑ کے عجائب و غرائب کا کوئی حساب و شمار نہیں مگر ہاں یہ بات ضروری ہے کہ خُدا و رسُولؐ اور صاحبِ امرؑ کی اطاعت کے وسیلے سے چشمِ بصیرت طلب کی جائے، تاکہ ظاہر و باطن میں ہمیشہ معجزاتِ خُداوندی کا مشاہدہ ہوتا رہے۔

اگرچہ یہ بات دُرست ہے کہ حضرت سلیمانؑ، جن کی سلطنت انبیاؑ و ائمہؑ کی رُوحانی مملکت کی مثال تھی، ظاہری اور باطنی دونوں اعتبار سے بادشاہ تھے، تاہم علم و آگہی کا فائدہ اِسی میں ہے کہ ہم حقیقتِ حال کو صحیح معنوں میں سمجھیں، وہ یہ ہے کہ آپؑ زیادہ سے زیادہ رُوحانی بادشاہ تھے، آپؑ کا اصل لشکر جس میں جن، اِنس، اور پرندے کام کرتے تھے (۲۷/۱۷) رُوحانی صُورت میں تھا، اور ہر وہ طاقت یا معجزہ جس کا ذکر آپؑ سے متعلق قصّے میں آیا ہے رُوحانی قسم کا تھا، اِس کے معنی یہ ہُوئے کہ ہر پیغمبر اور ہر امام اپنے زمانے میں سلیمان کی طرح رُوحانی سلطنت کا مالک

ہُوا کرتا ہے۔

۲۰۔ ہر مومن کا زبردست فائدہ اِسی میں ہے کہ وہ اپنے امامِ وقتؑ کو دینی اور رُوحانی بادشاہ کے طور پر تسلیم کرے، وہ امام کے عشق و محبّت کی لازوال دولت سے اپنے دل و جان کو مالا مال بناتے، کیونکہ امام کی محبّت رسُول کی محبّت ہے اور رسُولؐ کی محبّت خدا کی محبّت ہے، اور اسی طرح جب بندۂ مومن اللہ تعالیٰ کا دوست ہوگا تو خُدا بھی اُس سے دوستی کرے گا، اور یہ آسمانی دوستی دین کی گوناگون نعمتوں اور طرح طرح کی نوازشوں کی شکل میں ہوگی۔ اَلحَمدُ لِلّٰہ عَلیٰ اِحسَانِہٖ۔

آپ کا علمی خادم

نصیرُالدّین نصیرؔ ہونزائی

۲۹ر اگست ۱۹۸۳ء

کراچی

ایک عُمدہ سوال

میرے بہت ہی عزیز الواعظ صغیر الدین جو علیؑ زمان صلوات اللہ علیہ کے جان نثار عاشقوں میں سے ہیں، جو شمع علم کے پروانہ اور بادہ عرفان کے مستانہ ہیں، اور جن کو خداوندِ عالم کی طرف سے بہت سی فطری صلاحیتیں عطا ہوئی ہیں، وہ کبھی کبھار اس کمترین خادم کو خلوص و محبت کی خوشبوؤں سے بھرپور خط لکھتے ہیں، ایسے دلکش و پسندیدہ خطوط میں بعض دفعہ علمی سوالات بھی ہوا کرتے ہیں، چنانچہ انہوں نے اس دفعہ ایک بے حد پیارے خط میں ایک عمدہ سوال بھیجا ہے، جو درج ذیل ہے:-

"آخر میں ایک سوال کرنے کی جسارت کر رہا ہوں، اُمید ہے کہ جواب سے نوازیں گے۔

سوال: جمادات (یعنی مٹی) سے نباتات اُگتے ہی اپنے سر کو سیدھا اُوپر کی طرف کرتی ہیں، جبکہ حیوانات کا سر سیدھا آگے یعنی سامنے کی طرف ہوا کرتا ہے، اور جبکہ انسان کا سر سیدھا اُوپر کی جانب ہے، ان تین مختلف حالتوں میں کیا رازِ حکمت پوشیدہ ہے؟"

آپ دیکھتے ہیں کہ سوال عقل و دانش کی کس گہرائی اور گیرائی سے کیا گیا ہے، اور ان کی قوتِ جستجو میں کتنی صفائی اور وسعت آگئی ہے!

جواب: آپ کا یہ کہنا بالکل دُرست اور بجا ہے کہ ہر نبات خواہ وہ درختِ سرو کی طرح سرفراز ہو یا خربوزے کی بیل کی طرح زمین پر پھیلنے والی، بہرکیف اس کا سر اُگنے کے ساتھ ساتھ آسمان کی طرف ہو جاتا ہے، یہ اِس کی فطری ہدایت اور رجُوع ہے اس نظامِ ربُوبیّت کی طرف، جو مادّی آسمان اور سُورج کے وسیلے سے مہیّا ہے، تاکہ حرارت، روشنی، بارش، اور ہَوا سے اِس کی تربیّت و پرورش ہو، اور تمام نباتات کی یہ پرورش نہ صرف جڑوں کی راہ سے ہوتی ہے، بلکہ شاخوں کے طریق سے بھی ہُوا کرتی ہے، اِس میں خُدائے حکیم کا یہ حکیمانہ اشارہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی اَنا کو زمینِ دین سے اُگا کر آسمانِ علم اور آفتابِ ہدایت کی طرف متوجّہ ہو جانا چاہتا ہے تو وہ بصد خُوشی ایسا ہو سکتا ہے، تاکہ وہ دینِ خُدا کے باغ کا ایک تو نہال (نوخیز پودا) قرار پائے، جس کی رُوحانی اور علمی پرورش کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا ہے:-

اور اگر وہ لوگ توریت کی اور انجیل کی اور جو کتاب ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے پاس بھیجی گئی اس کی پابندی کرتے تو وہ لوگ اپنے (سر کے) اُوپر سے اور اپنے پاؤں کے نیچے سے خُوب فراغت سے کھاتے (۵/۶۶) یعنی راہِ رُوحانیت کی ایک منزل ایسی بھی ہے، جہاں سالک کے سر کی جانب سے ذرّاتِ علوی نازل اور پاؤں کی طرف سے

ذرّاتِ سفلی داخل ہو جاتے ہیں، تاکہ وہ خوش نصیب بندہ ایک سدا بہار درخت کی طرح نشوونما پائے، جیسے بی بی مریمؑ کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :-

وَ اَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا (۳/۳۷) اور اس (یعنی مریمؑ) کو بڑی عمدگی سے اُگایا۔ اگر نباتات اور درختوں میں کامل و مکمّل اِنسانوں کی مثالیں نہ ہوتیں، تو قرآنِ حکیم میں ایسا کوئی تذکرہ نہ ملتا۔

چونکہ حیوان کو جو مقام ملا ہے وہ نبات اور اِنسان کے درمیان واقع ہے، اِس لئے اِس میں آدمی کے عروج و نزول دونوں کی مثالیں موجود ہیں، اِس کے یہ معنی ہوئے کہ حیوان کی مثال میں تاویل کا ایک اچھا اور ایک بُرا دو پہلو ہیں، یہی وجہ ہے کہ قرآنِ پاک میں اَنعام یعنی چوپایوں سے کبھی تو بعض حدودِ دین کی تشبیہہ دی گئی ہے اور کبھی جاہل و نادان اِنسانوں کی تمثیل، سو اِس سوال کا جواب کہ "حیوان کا سر کیوں آگے کی طرف بڑھا ہوا ہے اور کیوں زمین پر بار بار جھکتا ہے ؟" دو طرح سے دیا جائے گا :-

الف : نبات کا سر آسمان کی جانب ہے، اور اسی حالت میں وہ حیوان کی طرف متوجّہ ہے، کیونکہ اِس کے سر پر حیوان ہے، اِس کی تاویل یہ ہے کہ ماتحت رُوحوں پر حدودِ دین کی بادشاہی ہے، جس میں حُکمرانی اور فیضِ تعلیم کا رُخ ان ارواح کی طرف ہے، تاکہ ایسی رُوحیں حدود کی معراج (سیڑھی) سے عروج کر جائیں، اور

ساتھ ہی ساتھ حدُود کو درجۂ کمال حاصل ہو، جس طرح نبات اور حیوان کے باہم رُوبرُو ہونے سے دو طرفہ فائدہ ہوتا ہے، کہ نبات بصُورتِ حیوان زندہ ہو جاتی ہے، اور حیوان زندگی کے مراحل میں آگے بڑھتا ہے۔

ب : حیوان کے جس پہلو سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ بعض لوگ حیوانوں کی طرح نفس کی پستیوں میں گرے ہُوئے ہیں، وہ یُوں ہے کہ حیوان سرنگون ہے، جبکہ اُس نے آسمان کی طرف پشت پھیر دیا ہے، یعنی مثال کے طور پر وہ اِنسان سے رُوگردان ہے جو اس کا آسمان ہے، اس کی تاویلی حکمت یہ ہے کہ جو لوگ مرتبۂ انبیاؑ و اولیاؑ (جو علم و معرفت کا آسمان ہے) کی طرف پیٹھ پھیرتے ہیں، ان کا سر ہمیشہ ذِلّت و خواری کی پستی میں جُھکا رہتا ہے، جس طرح حیوان کا سر گھاس کی خاطر جُھکتا رہتا ہے۔

اب اِس سوال کا جواب ہونا چاہیئے کہ انسان کا سر سیدھا اُوپر کی طرف کیُوں ہے؟ اور وہ یہ ہے کہ جو لوگ صحیح معنوں میں انسان ہیں، وہ اپنے سر کو رُوحانی آسمان کی طرف کر لیتے ہیں، سر میں حواسِ ظاہر و باطن ہیں جن کو یہ لوگ نُورِ ہدایت کی طرف مبذول و مرکوز کر لیتے ہیں، تاکہ ان کو رفعت و برتری ملے۔

سلسلۂ ترقّی و تنزّل میں ایک حیوان اِنسان سے پہلے آتا ہے اور دُوسرا بعد میں، جو جانور پہلے آتا ہے، وہ اچھا بھی ہو سکتا ہے اور بُرا بھی، مگر جو حیوان اِنسانی درجے کے بعد آتا ہے، وہ بہت ہی بُرا ہے، چُنانچہ ماضیٔ بعید کے وہ بندر اور سُؤر اِنتہائی خبیث اور ذلیل حیوان تھے، جو بعض نافرمان آدمیوں کے مسخ ہو جانے سے بن گئے

تھے، خواہ یہ مسخ ظاہری ہو یا باطنی، کیونکہ قرآنی حکمت کا کہنا یہ ہے کہ بعض لوگ انسانی شکل میں ہوتے ہوئے حیوان بن جاتے ہیں، جیسا کہ فرمانِ خداوندی ہے:-

جنات اور آدمیوں میں سے بہت سے ہیں جن کو ہم نے دوزخ کے لئے پیدا کیا ہے ان کے دل ہیں جن سے وہ نہیں سمجھتے اور ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ نہیں دیکھتے اور اُن کے کان ہیں جن سے وہ نہیں سُنتے وہ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ زیادہ گمراہ ہیں (اور) وہی لوگ غافل ہیں (۷/۱۷۹) اس سے ظاہر ہے کہ جو شخص نافرمان ہے وہ نادان ہے، اور جو اس قسم کا نادان ہے، وہ بحقیقت حیوان ہے، اگرچہ بظاہر انسان ہے۔

سورۂ یٰسین (۳۶/۶۷) میں ارشاد فرمایا گیا ہے: اور اگر ہم چاہتے تو ان کو اپنی جگہ پر ہی مسخ کر دیتے پھر وہ چل ہی نہیں سکتے اور نہ ہی لوٹ سکتے۔ اپنی جگہ سے انسانی جسم اور شکل و صورت مُراد ہے، مسخ کے معنی رُوحِ انسانی کا حیوان بن جانا ہیں، چل نہ سکنا ترقّی نہ کر سکنا ہے، اور رجُوع نہ کر سکنا توبہ نہ کر سکنا ہے، پس کسی کے مسخ ہو جانے سے اس کی رُوح بلندیٔ انسانیّت سے پستیٔ حیوانیت میں گر گئی ہے، اس لئے وہ شخص نہ تو اخلاقی اور رُوحانی پیش رفت کر سکتا ہے اور نہ خُداوند کے حضور میں رجُوع۔

عاجزانہ دُعا ہے کہ خُداوندِ عالم جملہ مُسلمین و مومنین کو جیسا کہ چاہئے توفیقِ اِطاعت عنایت فرمائے! بحقِّ محمّد و آلہ الطاہرین۔

خاکپائے مومنین: نصیر الدّین نصیر ہونزائی

لندن
۲۰ر جون ۱۹۸۴ء

سفر اور مشاہدات

خانۂ حکمت و ادارۂ عارف کے معزز عملدار و ارکانِ کراچی اور شمالی علاقہ جات جو میرے قلب و رُوح کے انتہائی عزیز اور جان و جگر کے ٹکڑے ہیں، اُن سب کو خُدائے برحق دُنیا و عقبیٰ کی سلامتی، ترقی اور کامیابی سے نوازے اور سرفراز فرمائے! آمین یارب العالمین!!

میں نعمت شناسی، قدر دانی، اور شکر گزاری کی قلبی کیفیت میں شرق و غرب کے تمام عزیزان کو یا علی مدد کی مقدس دُعا و سلام کرتا ہُوں، اور اُن سے ہمیشہ ایسی دُعا کی توقع رکھتا ہُوں، کیونکہ یہ عالی شان دُعا ربّانی رحمتوں اور برکتوں سے لبریز ہے۔

الحمدُ للہ، میں ۱۸ر جُون بوقتِ شب گیارہ بجے کراچی سے بذریعہ طیارہ پرواز کر کے براہِ تاشقند اور ماسکو دُوسرے دن لندن پہنچ گیا، تقریباً ۲۰ گھنٹے کا یہ ہوائی سفر جس میں پرواز اور وقفہ دونوں شامل ہیں، اور جس کی مُسافت شاید بارہ ہزار کلومیٹر سے بھی زیادہ ہے میرے لئے بڑا عجیب و غریب تھا، کراچی سے میری روانگی کے دوران اور لندن میں آمد کے موقع پر

عزیزوں نے میری مدد کرتے ہُوئے جس خلوص و محبّت کا مظاہرہ کیا، وہ مجھے ہمیشہ ہمیشہ یاد رہے گا۔

کوئی شک نہیں کہ رُوحانی سفر اِس ظاہری اور جسمانی سفر سے کہیں زیادہ حیرت انگیز اور بڑا اہم ہُوا کرتا ہے، جس میں رُوح اور ذرّاتِ رُوح پر گوناگون عجائب و غرائب گزرتے ہیں، اور اگر یہ حقیقت مان لی جائے کہ ہم بحیثیتِ ذرّاتِ رُوح ایک دُوسرے میں آتے جاتے رہتے ہیں، تو پھر رُوح کے اِس قانونِ بسیط و ہمہ جائی سے یہ امر لازمی ہو جاتا ہے کہ نہ صرف اِسی سفر میں بلکہ مُلکِ چین کے عظیم سفر میں بھی ہم سب طلبِ علم کی خاطر ساتھ تھے، تاکہ فردائے قیامت ہم سب اپنا کوئی مُشترکہ کارنامہ دیکھ پائیں (اِنشاء اللہ تعالیٰ)۔

مولائے رُوم جیسے منزلِ طریقت میں کامیاب اور عظیم صُوفیوں کے منظوم کلام میں رُوحانیّت کے عجیب و غریب تصوّرات ہوتے ہیں لیکن غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ اسماعیلی رُوحانیّت و حقیقت کی باتیں سب سے زیادہ تعجّب خیز ہُوا کرتی ہیں، جس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ یہاں کا اِنتہائی دُور دراز رُوحانی سفر مظہرِ نُورِ خُدا کی رہنمائی میں کامیاب ہو جاتا ہے، اور ہر مُشاہدہ رفتہ رفتہ علم و عرفان کا ایک خزانہ بن جاتا ہے۔

دُنیائے ظاہر کے تینوں زمانے یعنی ماضی، حال، اور مُستقبل انسان سے یا تو دُور ہی رہتے ہیں یا بھاگ جاتے ہیں، اِس کی وضاحت یُوں

ہے کہ ماضی گزر چکا ہوتا ہے، حال بڑی سُرعت سے گزر جاتا ہے، مُستقبل قریب تیزی سے آکر نکل جاتا ہے، اور مُستقبل بعید دُور ہی رہتا ہے، جس کے سبب سے آدمی کُل زمانوں کے واقعات وحالات سے ناآشنا ہو کر حسرت و یاس میں مُبتلا ہو جاتا ہے، اِس کے برعکس رُوحانیّت اور بہشت میں زمانہ ساکن یعنی ٹھہرا ہُوا زمانہ ہے، جو حال ہی حال ہے، اور اس کا کوئی ماضی و مُستقبل نہیں، چُنانچہ بہشت کا جو نہ گزر جانے والا زمان ہے، وہ دہر کہلاتا ہے، جس میں دُنیا کے سارے زمانے مرکوز ہو کر لازوال بن جاتے ہیں۔

جب قرآنِ حکیم کہتا ہے کہ قیامت کے دِن کائنات خُداوند تعالیٰ کے دستِ راست میں لپٹی ہُوئی ہوگی (۳۹/۶۷) تو اِس ارشاد سے ہمیں یہ جاننا چاہیئے کہ اِس آیۂ حکمت آگین میں جس طرح پھیلا ہُوا مکان (کائنات) کے مرکوز ہو جانے کا ذکر ہے، اِسی طرح پھیلا ہُوا زمان کے یکجا ہو کر سامنے ٹھہر جانے کا بھی تذکرہ ہے، کیونکہ زمان آسمانوں کی حرکت کا نام ہے، لہٰذا زمان مکان (یعنی کائنات) سے الگ نہیں ہو سکتا چُنانچہ جب بہ امرِ خُدا مکان وسیع و بعید ہونے کے بعد مرکوز و قریب ہو جاتا ہے تو اسی کے ساتھ ساتھ زمان بھی ماضی و مُستقبل کی دُوری کو چھوڑ کر مرکزِ حال میں سمٹ جاتا ہے، اِس کے یہ معنی ہُوئے کہ رُوحانیّت اور بہشت کی ہر چیز مکانی اور زمانی مُسافتوں کے بغیر نزدیک اور سامنے ہوتی ہے، جیسا کہ ربِّ حکیم کا ارشاد ہے:۔

وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ غَيْرَ بَعِيْدٍ (۵۰/۳۱) اور

بہشت پرہیزگاروں کے لئے بالکل قریب کردی جائے گی۔ یعنی جنّت، جو طول وعرض میں آسمانوں اور زمین کے برابر ہے (۳/۱۳۴، ۵۷/۲۱) ایک گوہر کی مقدار میں محدود مرکوز ہوکر سامنے آئیگی۔

در اصل مجموعۂ کائنات، یعنی آسمانوں، زمین، اور اُن میں جو کچھ ہے اس کی چار صورتیں ہیں، جسمِ کثیف، جسمِ لطیف، رُوح، اور عقل، ان میں سے کثیف جسم آسمان وزمین یعنی کائنات ہے، لطیف جسم اور کائناتی رُوح وہ بہشت ہے جو کائنات کے برابر ہے، اور عقل وہ بہشت ہے جو پرہیزگاروں کے لئے نزدیک لائی گئی ہے، جس کا ذکر اُوپر ہوچکا ہے۔

اگر مانا جائے کہ قیامت رُوحانی ترقی اور اللہ کی نزدیکی کا نام ہے، جو فرداً فرداً ممکن ہے (۶/۱۴۴) پھر اِس کا مطلب یہ ہوگا کہ اصل قیامت انفرادی حالت میں پیش آتی ہے، جس میں ایک اجتماعی قیامت بھی پوشیدہ ہوا کرتی ہے، اور اگر حقیقت یہی ہے تو پھر کوئی زمانہ اِس رُوحانی قیامت کے سلسلے سے خالی نہیں ہے، مگر یہ بات الگ ہے کہ کوئی قیامت چھوٹی ہو اور کوئی بڑی، اِس تصوّر سے یہ سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ اگر حقیقت ایسی ہے تو پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم میں وقوعِ قیامت کا بیان اکثر صیغۂ مستقبل میں فرمایا گیا ہے؟ جیسے فرمانا کہ قیامت آنے والی ہے؟

اِس کے جواب میں یُوں عرض ہے کہ سوائے کامل اِنسانوں کے لوگوں پر شعوری قیامت نہیں گزری ہے، لہٰذا انہی عوام کی نسبت سے

قیامت کا تذکرہ صیغۂ مستقبل میں فرمایا گیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے کسی بھی فعل میں بحقیقت ماضی اور مستقبل نہیں ہے، اِس لئے کہ ماضی اُس کا ہوتا ہے جس کے ہاتھ سے وقت کا ایک حصّہ گزر چکا ہو، اور مستقبل اس کا ہوتا ہے جس کی رسائی آنے والے وقت تک نہ ہوتی ہو، مگر خُدا وہ ذاتِ پاک ہے، جس کے قبضۂ قدرت میں زمان و مکان کی تمام چیزیں محدود ہیں، اِس کا مطلب یہ ہُوا کہ مقامِ عقل پر سارا زمانہ ایک محدود اور ٹھہرا ہُوا زمانۂ حال بن کر اللہ کے حضور میں سجدہ کر رہا ہے، جس طرح زمان و مکان کی سب چیزیں سجدہ کرتی ہیں ($\frac{19}{74}$) -

امامِ زمانؑ کے غلاموں کا غُلام

نصیر الدّین نصیر ہونزائی

لندن :

۲۲ / جُون ۱۹۸۴ء

خزائنِ خُدا

یہ قرآنِ حکیم اور دینِ اسلام کی ایک تابندہ حقیقت ہے کہ خُداوند تعالیٰ کے حضورِ اقدس میں اس کی خُدائی اور بادشاہی کی موجُود ہونے والی تمام چیزوں کے خزائن ہیں، جیسا کہ اُس کا حکمت آگین فرمان ہے :-

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (۱۵/۲۱) اور کوئی چیز (اس قانون کے سوا) موجُود نہیں مگر اُس کے خزانے ہمارے پاس ہیں اور ہم اس کو (بحیثیتِ مجموعی) نازل نہیں کرتے مگر ایک دانستہ مقدار میں۔

اِس آیۂ مقدّسہ سے جو انتہائی عظیم حکمتوں سے مملو ہے ایک ایک ہوکر کئی روشن حقیقتیں سامنے آتی ہیں، مثال کے طور پر :۱ : اللہ کے خزانے ایسے ہیں کہ اُن سے باہر کسی چیز کا حقیقی وجُود ہی نہیں ۲ : خُدا تعالیٰ کی ذاتِ پاک ایسی نہیں کہ اُس سے کوئی چیز خارج اور نازل ہو، جبکہ یہ صفت اُس کے خزانوں کی ہے کہ اُن سے ہر چیز نازل ہو جاتی ہے،

سہ : اِس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ خُدائے سُبحان و برتر بذاتِ خود کوئی خزانہ نہیں، بلکہ وہ جُملہ خزانوں کا حقیقی مالک اور بادشاہِ مطلق ہے سہ : اِس بُنیادی قانُون کے مطابق اِنسانی رُوح بھی خزائنِ الٰہی میں موجُود ہے، اور وہ دُوسری تمام چیزوں کی طرح جُزوی طور پر اِس دُنیا میں آئی ہے، کُلّی طور پر نہیں، یعنی اِس کا اکثر حِصّہ خزائنِ خُدا میں موجُود ہے سہ : اِس آیۂ کریمہ میں اللہ تعالیٰ کی "عِندیّت" کا تصوّر ہے، اور خُدا کی عِندیّت (نزدیکی) صرف عقلی، رُوحانی، اور دینی حیثیت میں ہے، مکانی حالت میں ممکن نہیں، چُنانچہ خُداوندِ پاک و برتر کے سب سے اساسی اور انتہائی عظیم خزانے پانچ ہیں : کلمۂ باری، قلم، لوح، ناطق، اور اساس، جیسے آپ دیکھ سکتے ہیں کہ "عندنا خزائنہ" کے پانچ منفصِل اجزاء ہیں جیسے :

عند + نا + خز + ا + ئنہ = ۵

امامِ مُبین (یعنی امامِ زمان) صلوات اللہ علیہ وسلامہ ہر زمانے میں خزائنِ خُدا کا مظہر اور نمائندہ ہُوا کرتا ہے، تاکہ اِسلام جو دینِ خُدا بھی ہے اور دینِ فطرت بھی، اِس میں کسی قسم کی کمی اور تنگی نہ ہو، جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا ہے : وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُبِينٍ (۳۶/۱۲) اور ہم نے ہر چیز کو ایک صریح و روشن پیشوا میں گھیر دیا ہے۔ دُوسرا ترجمہ اور تشریح : اور ہم نے ہر چیز کو امامِ مُبین میں گن رکھا ہے، یعنی تمام ارواح کے ذرّات کو ۳۶۰ داعیوں میں سما دیا ہے، ان داعیوں کو ۱۲ حُجّتوں میں محدُود کر دیا ہے، پھر اِن حُجّتانِ جزائر کو حُجّتانِ حضور

(مقرّب) میں جمع کر دیا ہے، جو چار ہیں، اور آخر میں ان چاروں کو حضرت ابراہیمؑ کے چار پرندوں کی طرح امام کی ذاتِ عالی صفات میں زندہ کر دیا ہے، یہ ہُوا خدا کا تمام چیزوں کو حضرت امامؑ میں گن کر رکھنا، اور اللہ تعالیٰ جب بھی چیزوں کو گننا چاہتا ہے تو اسی طرح فعلاً گن کر عددِ واحد میں سما دیتا ہے۔

اِس پُر حکمت آیت کا تیسرا ترجمہ اور تشریح اِس طرح ہے: اور ہم نے ہر چیز کو امامِ مُبینؑ کی ذات میں گوہر بنا دیا ہے، حصی عربی زبان میں کنکر کا نام ہے، اور اس کی تاویل گوہرِ عقل ہے، کیونکہ گوہر قیمتی پتھر ہُوا کرتا ہے، چُنانچہ یہ گوہر اپنی ذات میں عالمِ عقل ہے، اور اس میں ہر چیز کا عقلی صُورت میں ہونا لازمی ہے، نُورِ عقل کی تشبیہہ و تمثیل جس طرح ایک گوہر سے دی گئی ہے، اِس میں بے شمار حکمتیں پوشیدہ ہیں، اور اُن میں سے ایک عظیم حکمت یہ ہے کہ ظاہری مخلوقات کی ترتیب جمادات یعنی پتھر وغیرہ سے شروع ہو جاتی ہے، اور باطنی موجُودات کی مثال بہت سے مراحل سے گزر جانے کے بعد پتھر (یعنی گوہر) پر آکر تمام و کامل ہو جاتی ہے، تاکہ تصوّرِ آفرینش میں دائرے کی جو اہمیّت ہے وہ ظاہر ہو جائے۔

خزائنِ خُدا کا موضوع قُرآنِ حکیم میں بہت بڑی اہمیّت کا حامل ہے، آپ جانتے ہیں کہ قرآنِ پاک میں بحکمِ الکِتٰبِ تِبیٰنًا لِّکُلِّ شیٍ ۶ (۱۶/۸۹) ہر چیز کا بیان ہے، وہ اِس طرح کہ بعض چیزوں کا موضوع براہِ راست اور بالواسطہ دونوں صُورت میں ہے، اور بعض اشیاء کا تذکرہ براہِ راست

نہیں، صرف بالواسطہ بیان فرمایا گیا ہے، اور "خزائنِ خُدا" کا موضوع قرآنِ مقدس میں دونوں طرح سے آیا ہے۔

کسی مادّی خزانے کو محفوظ رکھنے کے کئی طریقے ہیں، مثلاً روایت ہے کہ زمانۂ قدیم میں بعض بادشاہ اپنے خزانوں اور دفینوں کی حفاظت طلسمات (جادُو) سے کرتے تھے، دُوسرا طریقہ یہ ہے کہ خزانے کو کسی پہاڑ کے جوف میں چُھپایا جائے یا کسی ویرانے میں زیرِ زمین پوشیدہ رکھا جائے، تاکہ لوگوں کو گمان ہی نہ ہو کہ اس خرابہ (کھنڈر) میں کوئی دفینہ موجُود ہے، اور تیسرا طریقہ یہ ہے کہ بیشک خزانے کی عمارت لوگوں کے سامنے ہو، مگر اس پر سخت قسم کے محافظ بٹھا دیئے جائیں اور اس کی کُنجی خزانچی کی تحویل میں دے دی جائے، اور اپنے خزانوں سے متعلق اللہ تعالیٰ کی عادت بھی ایسی ہی ہے۔

قرآنِ حکیم علم و حکمت کی سب سے عظیم دُنیا (عالَم) ہے، اس میں اگلے لوگوں کی ایمانی اور رُوحانی آبادی اور بربادی کے تمام نقوش موجُود ہیں، سو آیئے ہم قارُون کی ہلاکت کے کھنڈر کو دیکھتے ہیں، جس پر قرآنِ پاک اس طرح روشنی ڈال رہا ہے: اور ہم نے قارُون کو اس قدر خزانے عطا کئے تھے کہ ان کی کنجیاں ایک سکندار جماعت کو اُٹھانا دوبھر ہو جاتا تھا (۲۸/۷۶) قارُون حضرت مُوسیٰ علیہ السّلام کی قوم کا ایک فرد تھا، اِس پر رُوحانی دولت کا انکشاف ہُوا تھا، جس کے خزانوں کی کُنجیاں لے کر رُوحوں کی ایک زبردست جماعت سامنے آئی

تھی، مگر قارُون نے علمی زکات دینے کی حکمت کو نہیں سمجھا، جس کی وجہ سے وہ ہلاک ہوگیا، یہ قانُونِ خُدا کی ایک مثال ہے کہ وہ اپنے اعلیٰ اور ذیلی خزانوں کو کہاں کہاں اور کس طرح پنہان رکھتا ہے۔

خزائنِ خُدا کے سلسلے میں اِس اصُول کا جاننا ضرُوری ہے کہ کنزِ کلمۂ باری کا باب (دروازہ) قلم ہے، خزانۂ قلم کا باب لوحِ محفوظ ہے، گنجِ لوح کا باب ناطقؑ، خزینۂ ناطقؑ کا باب اساسؑ، گنجینۂ اساسؑ کا باب امامِ زمانؑ، اور امامِ زمانؑ کے خزائنِ انوار کا دروازہ آپؑ کا اس دُنیا میں حاضر رہنا ہے[1]۔

خاکپائے جماعت

نصیر الدّین نصیر ہونزائی

لندن : ۲۵ر جُون ۱۹۸۴ء

---

[1] : امامِ زمانؑ کا باب (دروازہ) حُجّتِ اعظم ہُوا کرتا تھا، مگر اب امام برحقؑ یہ ٹائیٹل بظاہر کسی کو نہیں دیتے، اور نہ ہی وارثِ امامؑ کے سوا ظاہراً کوئی حُجّت ہے۔

چند سوالات وجوابات

سوال ۱ : قرآنِ کریم کی جن آیاتِ مُقدّسہ کا تعلق حِکمت کے موضوع سے ہے، اُن میں سے بعض ارشادات سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ حِکمت سکھائی جاتی ہے، جبکہ دُوسری آیات سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ حِکمت دی جاتی ہے، آیا حِکمت کے سکھانے اور دینے میں کوئی فرق ہے یا دونوں لفظوں کا مطلب ایک ہی ہے ؟

جواب : سکھانے اور دینے کے معنی میں بڑا فرق ہے کیونکہ سکھانا یا تعلیم دینا زبان کا قول ہے، اور دینا یا عطا کرنا ہاتھ کا فعل، چُنانچہ ظاہر میں اور مقامِ رُوح پر حِکمت سکھائی جاتی ہے، مگر مرتبۂ عقل پر دستِ خُدا خود ہی نُورِ حِکمت عطا کر دیتا ہے، جب آپ قُرآنِ پاک میں غور سے دیکھیں گے تو یہ حقیقت روشن ہو جائیگی کہ حِکمت سکھانے کا تعلق انبیائے کرام علیہم السّلام سے ہے، جبکہ حِکمت عطا کر دینے کا ذکر اللہ تعالیٰ کے باب میں ہے۔

سوال ۲ : وَاٰتَیْنٰهُ الْحِکْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ (۳۸/۲۰)

براہِ کرم آپ اِس آیۂ کریمہ کی وضاحت کر کے بتائیں کہ حضرت داؤد علیہ السّلام کو حکمت کے علاوہ فصل الخطاب کے نام سے اور کیا چیز عطا ہُوئی تھی ؟

جواب : اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السّلام کو حکمت کے عنوان سے نُورِ عقل عطا کیا تھا، اور " فَصْلَ الخِطاب " کے نام سے کلمۂ باری کا سب سے عظیم خزانہ، فصل الخطاب کلمۂ باری کے ناموں میں سے ہے، جس سے تمام بحثوں کا فیصلہ ہو جاتا ہے، اور اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ اس کے اُوپر کوئی کلام نہیں۔

سوال ۳ : سورۂ ابراہیم کے ایک فرمانِ خُداوندی (یعنی ۱۴/۳۴) کا مطلب یہ ہے کہ " خُداوندِ عالم نے بنی نوعِ اِنسان کو یا صرف اہلِ ایمان ہی کو وہ سب کچھ دے رکھا ہے، جس کے لئے درخواست کی گئی تھی " اِس میں کل بروز آخرت ہر چیز دینے کی بات نہیں، بلکہ آج اِسی دُنیا میں سب کچھ دیا گیا ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اِنسان بڑا مفلس ہے، پھر اِس آیۂ مُقدّسہ میں کیا راز پوشیدہ ہے ؟

جواب : اِنسان اپنی رُوحِ عُلوی کی اصلیّت کے ساتھ بہشت میں ہے، مگر اس کی شخصیّت بطورِ سایہ اِس دُنیا میں ہے، لہٰذا اِس قدآنی حقیقت میں کوئی شک نہیں کہ اِنسان کو جنّت کی زندگی میں آج بھی اور کل بھی سب کچھ حاصل ہے۔

سوال ۴ : قرآنِ مجید میں فرمایا گیا ہے کہ بہشت میں اہلِ بہشت کو ان کی خواہش کے مطابق ہر چیز اور ہر نعمت ملے گی، اِس

میں پوچھنا یہ ہے کہ اگر ایک شخص جنّت میں رہتے ہوئے دُنیا کی بادشاہت کو بھی چاہتا ہو تو یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ اس کو آخرت کے اندر دُنیا مل جائے ؟

جواب : دُنیا میں آخرت پوشیدہ ہے اور آخرت میں دُنیا موجود و عیان ہے، کیونکہ وہ ایک زندہ اور باشعور آئینہ ہے، جس میں دُنیا کا عکس زندۂ جاوید ہو جاتا ہے، چُنانچہ جنّت کی نعمتوں میں اِس دُنیا کا لطیف پہلو بھی شامل ہے، کیونکہ اگر سائنسدان عاجز انسان ہونے کے باوجود فلم کی ایک دُنیا اور پھر اس کی بہت سی کاپیاں بنا سکتے ہیں، تو جو بُزرگ فرشتے قادرِ مطلق کی طرف سے اِنسانوں کے انفرادی اور اجتماعی اعمال ریکارڈ کرنے کے لئے مقرّر ہیں، وہ اِن سے کہیں زیادہ باشعور اور باحقیقت دُنیائیں بنا سکتے ہیں (۱۰-۱۲/۸۲) -

سوال ۵ : سورۃ معارج میں فرمایا گیا ہے : تو میں مشرقوں اور مغربوں کے پروردگار کی قسم کھاتا ہُوں کہ ہم ضرور اس بات کی قدرت رکھتے ہیں کہ ہم انکو اِس سے بہتر حالت میں تبدیل کریں اور ہم عاجز نہیں ہیں (۴۰-۷۰/۴۱) ایک ایک سے زیادہ مشرق و مغرب کہاں ہیں ؟ مشرق و مغرب کو پروردگار کس طرح پالتا ہے ؟ لوگوں کو خُدا کس معنی میں بہتر حالت میں تبدیل کرے گا ؟

جواب : یہ عالمِ عقل کی بات ہے جہاں ایک ہی مقام مشرق و مغرب دونوں کا کام انجام دیتا ہے، مگر وہاں خورشیدِ نور اپنے طلوع و غروب سے ہر بار علم کے ایک نئے دن اور حکمت کی ایک نئی شب کا مظاہرہ

کرتا ہے، لہٰذا اس کے بہت سے مشرقوں اور مغربوں کا ذکر فرمایا گیا، پروردگار کی جانب سے عالمِ عقل کی تربیت و پرورش یہ ہے کہ اسے کلمۂ باری سے فیضانِ تائید حاصل ہوتی رہتی ہے، خداوند تعالیٰ لوگوں کو موجودہ جسم سے بہتر حالت میں تبدیل اس طرح کر سکتا ہے کہ وہ انکو جسمِ لطیف میں تبدیل کرنے والا ہے۔

سوال ۶: آپ کی تحریروں میں بار بار جسمِ لطیف کا ذکر آتا ہے، مگر میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے اِس سلسلے میں قرآنِ کریم کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے، تو کیا آپ اِس باب میں ہمیں قرآنِ پاک سے کچھ بتائیں گے؟

جواب: وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ۔ عَلَىٰ أَن نُّبَدِّلَ أَمْثَالَكُمْ وَنُنشِئَكُمْ فِي مَا لَا تَعْلَمُونَ (۵۶/۶۰-۶۱) اور ہم اِس سے عاجز نہیں ہیں کہ تمہاری مثال (شخصیت) بدل ڈالیں اور تم لوگوں کو اِس صورت میں پیدا کریں جسے تم مطلق نہیں جانتے۔ یہ قرآنی حکم جسمِ لطیف کے بارے میں ہے، جس کو لوگ اِس وقت نہیں جانتے ہیں، نیز ارشاد ہے:۔ إِنَّا أَنشَأْنَاهُنَّ إِنشَاءً۔ فَجَعَلْنَاهُنَّ أَبْكَارًا (۵۶/۳۵-۳۶) ہم نے اُن (حوروں) کو پیدا کیا ہے جیسا کہ پیدا کرنے کا حق ہے، یعنی دُنیوی اور جسمانی زندگی کے جملہ مراحل سے گزار دیا ہے، پھر اُن کو کنواریاں بنایا ہے، یعنی مرجانے کے بعد انکو اجسامِ لطیف میں زندہ کر دیا ہے جیسے مولا علیؑ کا ارشاد ہے کہ ہر مومنہ عورت حوراء بن جاتی ہے، یعنی اس کو بہشت میں لطیف شخصیت مل جاتی ہے، اِس کے یہ معنی ہوئے کہ جسمِ لطیف

کی بات حقیقت ہے۔

سوال ۷ : قرآنِ پاک کے کئی نام ہیں، جن میں سے ایک نام "رُوح" ہے (۴۲/۵۲) آپ یہ بتائیں کہ قرآن کس طرح رُوح ہے ؟ کہاں ہے؟ اور ہماری رُوح کا اُس سے کیا رشتہ ہے ؟

جواب : قرآنِ مُقدّس آنحضرتؐ کے قلبِ مُبارک پر ایک عظیم رُوح کی صُورت میں بتدریج نازل ہُوا ہے، حضورِ انورؐ نے اسے دو طرح سے محفوظ کر دیا، ایک یہ کہ اسے تحریری شکل میں لایا گیا، اور دُوسرا یہ کہ اس کی رُوح آپؐ کے جانشین میں منتقل کر دی گئی، اِسی طرح قرآنِ پاک امامِ زمانؑ (جو وارثِ رسُولؐ ہے) میں ایک پاک رُوح ہے، اور یہی رُوح امامؑ کا نُور بھی ہے، اور ہماری رُوح کا اس سے رشتہ یہ ہے کہ یہ اُسی سے ہے، یعنی یہ اس کا جزو ہے۔

بندۂ کمترین

نصیر الدّین نصیر ہونزائی

لندن : ۲۶ر جُون ۱۹۸۴ء

دستِ خُدا کی حِکمتیں

حِکمت ۱ : اللہ تعالیٰ نے کائناتِ شخصی کے آسمانوں اور زمین کو نُورِ عقل سے بنایا، جیسا کہ اِس کا پاک ارشاد ہے : اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ خلق السّٰمٰوٰتِ والارضَ بِالحقِ (۱۴/۱۹) کیا تُو نے نہیں دیکھا کہ خُدا ہی نے سارے آسمان وزمین حق (یعنی نُورِ عقل) سے پیدا کیا۔

حِکمت ۲ : خُداوندِ حکیم نے دستِ راست سے نُورِ عقل کو سات مرتبہ حرکت میں لایا، جس سے سات عقلی آسمان موجُود ہو گئے، اور ہر آسمان سے متعلق امر ہُوا (۴۱/۱۲) اور نیچے والے آسمان کو چراغوں سے مزّین کیا، اور اس کو تمام آسمانی بھیدوں پر محافظ بنایا۔

حکمت ۳ : سات آسمان ایک دُوسرے کے مطابق وموافق ایک جیسے تھے، اِس لئے ان کی تخلیق کی نوعیت طِبَاقاً کہلائی (۶۷/۳) قرآنِ پاک میں عقلی آسمان کا ذکر کبھی صیغۂ واحد (سماء) میں فرمایا گیا ہے، اور کبھی صیغۂ جمع (سمٰوات) میں جس کی وجہ یہ ہے کہ نُورِ عقل اصلاً ایک ہی ہے، مگر اس کے وہ ظہورات جو آسمان سے متعلق ہیں سات مراتب

میں ہیں۔

حکمت ۴ : اسی نور سے عالمِ صغیر کی زمین پیدا کی گئی، وہ بھی اصل میں ایک ہی ہے، مگر اس کے درجات آسمان کی مثال پر سات ہیں (۶۵/۱۲) یہ نکتہ خوب یاد رہے کہ جس طرح عددِ واحد (ایک = ۱) سے اعداد کی ایک دُنیا اور اس کی ہر شے بن جاتی ہے، اسی طرح نورِ عقل (گوہرِ عقل) سے عالمِ شخصی کے آسمان و زمین اور ان کی ہر چیز پیدا کی گئی، اور یہ سب کچھ دستِ قدرت سے ہُوا۔

حکمت ۵ : ایک آیۂ کریمہ (۳۸/۷۵) کا مفہوم یہ ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السّلام کو اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا تھا، اس کی تاویل یہ ہے کہ خُداوندِ عالم نے آدمؑ کی تخلیق و تکمیل کے سلسلے میں حدودِ ظاہر اور حدودِ باطن دونوں سے کام لیا تھا، کہ خُدا کے بائیں ہاتھ سے ظاہری حدود مُراد ہیں، اور دائیں ہاتھ کے معنی ہیں باطنی حدود۔

حکمت ۶ : قرآنِ پاک میں کُل ۱۰۴ بار "فضل" کا ذکر آیا ہے، اور فضل زبانِ حکمت میں گوہرِ عقل کو کہتے ہیں، جو نورِ عقل ہے، چُنانچہ فرمایا گیا ہے کہ "فضل" اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے (۳/۷۳، ۵۷/۲۹)۔

حکمت ۷ : قرآنِ عزیز کی بعض سُورتوں کے آخر میں کوئی انتہائی پُرحکمت آیت ہُوا کرتی ہے، چُنانچہ سُورۂ یاسین کے اختتام پر ارشاد ہے : فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ بِیَدِہٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ وَّ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ (۳۶/۸۳) تو وہ خُدا (صفات سے) پاک ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی سلطنت ہے اور تُم لوگ اُسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے یعنی

خُدا ہر چیز اور ہر صفت سے پاک ہے، لہٰذا دستِ خُدا تعالیٰ سے دین کے اعلیٰ درجات مُراد ہیں، جن کے پاس ذاتِ سُبحان کی طرف سے ہر چیز کی عقلی اور رُوحانی سلطنت ہے، پس ملکوت یعنی سلطنت بھی اسی نورِ عقل (لُوئے عقل) میں ہے۔

حِکمت ۸ : حضرت مُوسیٰ علیہ السّلام یدِ بیضا (نُورانی ہاتھ) دکھانے کا معجزہ کرتے تھے، جس کے معنی یہ ہیں کہ آپ بدرجۂ دستِ خُدا عقلی اور علمی معجزات کر لیا کرتے تھے (۷/۱۰۸، ۲۰/۲۲، ۲۶/۳۳، ۲۷/۱۲، ۲۸/۳۲)۔

حِکمت ۹ : صدقہ کا لفظ صِدق سے ہے، اور صدق عقل کا نام ہے، چُنانچہ صدقہ ظاہر میں مالی زکات ہے، اور باطن میں عقلی و علمی زکات، جیسا کہ قُرآنِ پاک میں ارشاد ہُوا ہے : اے ایماندارو! جب پیغمبر سے سرگوشی کرنا چاہو تو اپنی سرگوشی سے پہلے کچھ صدقہ دے دیا کرو (۵۸/۱۲) صدقہ کہیں یا زکات، اس کا دینا اور لینا ہاتھ کا فعل ہے، لہٰذا فرمایا کہ تُم مقامِ عقل حاصل کرو تاکہ وہاں اِس سے پیشتر کہ تُم کلمۂ باری سے کوئی راز کی بات حاصل کرو، عقل کا صدقہ دے سکو گے۔

حِکمت ۱۰ : سورۂ توبہ (۹/۱۱۱) میں ارشاد فرمایا گیا ہے: اِس میں تو شک ہی نہیں کہ خُدا نے مومنین سے ان کی جانیں اور ان کے اموال اِس بات پر خرید کر لئے ہیں کہ (اِس سودے کی قیمت) ان کے لئے بہشت ہے، چُنانچہ یہ جو خرید و فروخت خُدا اور

بندۂ مومن کے درمیان ہو چکی ہے، اس کی عملی تاویل بھی عالمِ عقل میں موجود ہے، مگر چونکہ وہ مقامِ وحدانیت ہے، اس لئے وہاں صرف ایک ہی ہستی دو طرفہ عمل کا نمونہ پیش کرتی ہے۔

حکمت ۱۱ : بیعت کے معنی خرید و فروخت کے ہیں، لہٰذا ظاہر میں بار بار بیعت کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مومنین کہیں اس بات کو بھول نہ جائیں کہ خداوند تعالیٰ نے ان کی جان و مال کو خرید لیا ہے، پس بیعت کی رسم جس طرح ظاہر میں ہے، اسی طرح اس کا نمونۂ عمل مقامِ عقل پر ہے، کہ وہاں لینا دینا ہوتا ہے۔

حکمت ۱۲ : ارشادِ خداوندی ہے : وَاذْكُرْ عِبَادَنَا إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ أُولِي الْأَيْدِي وَالْأَبْصَارِ (۳۸/۴۵) اور (اے رسولؐ) ہمارے بندوں میں ابراہیمؑ اور اسحاقؑ اور یعقوبؑ کو یاد کرو جو ہاتھوں والے اور آنکھوں والے تھے۔ اس آیۂ مقدسہ میں حضراتِ انبیاء و آئمہ علیہم السّلام کے نورانی ہاتھوں کا ذکر ہے جن میں گوہرِ عقل کا مظاہرہ ہوتا ہے، اور باطنی آنکھوں کا ذکر ہے، جن سے اس مظاہرے کو دیکھا جاتا ہے، ورنہ ظاہری ہاتھ اور آنکھیں تو سب کی ہوتی ہیں۔

حکمت ۱۳ : اللہ تعالیٰ کا مقدّس فرمان ہے :

فِي صُحُفٍ مُكَرَّمَةٍ مَرْفُوعَةٍ مُطَهَّرَةٍ
بِأَيْدِي سَفَرَةٍ كِرَامٍ بَرَرَةٍ

(۸۰/۱۳-۱۶) قرآن بہت معزز اوراق میں ہے جو بلند رُتبہ اور پاک ہیں (ایسے) لکھنے والوں کے ہاتھ میں ہے جو بزرگ نیکوکار ہیں۔ یہ عقل کے اوراق ہیں جو بڑے باعزت، عالی مرتبت اور پاک ہیں، اور لکھنے والے انبیاء و اولیاء ہیں، اور ان کا لکھنا یہ ہے کہ وہ قلمِ عقل کو حرکت دیتے ہیں، جیسا کہ حرکت دینا چاہیئے، تاکہ قرآن کی عملی تاویل ہو۔

حکمت ۱۴: سورۂ عنکبوت کے ایک ارشاد (۲۹/۴۸) کا مفہوم یہ ہے کہ آنحضرتؐ نزولِ قرآن سے قبل نہ کسی آسمانی کتاب کو پڑھتے تھے اور نہ ہی دستِ راست میں قلمِ عقل لے کر اپنی ذات میں اس کی تاویل لکھتے تھے، مگر جب سے قرآن نازل ہوا تو تب سے آپؐ ایسا کرنے لگے۔

حکمت ۱۵: حضرت ابراہیمؑ نے داہنے ہاتھ سے بتوں کو توڑا تھا (۳۷/۹۳) اس کے یہ معنی ہیں کہ آپؑ نے غلط اور باطل باتوں کے بتوں کے خلاف نورِ عقل کی طاقت کو استعمال کیا تھا، اور اس میں آپؑ کا داہنا ہاتھ تھا۔

حکمت ۱۶: حضرت موسیٰؑ کی لاٹھی داہنے ہاتھ میں ہوا کرتی تھی (۲۰/۱۹) اس کی تاویل یہ ہے کہ یہ لاٹھی سب سے پہلے اسمِ اعظم اور ذکر کی صورت میں دائیں کان سے تعلق رکھتی تھی، پھر اس کے بعد عقل و علم کا نور بن کر باطن کے داہنے ہاتھ میں آگئی۔

حکمت ۱۷: فرمایا گیا ہے کہ ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے اور وہ ہلاک ہوگیا (۱۱۱/۱) اس میں سوچنے کی بات تو یہ ہے

کہ کیوں اِس مثال کے مطابق پہلے کافر کے دونوں ہاتھ ٹوٹ جاتے ہیں، اور اس کی وجہ سے وہ خود بھی مرجاتا ہے؟ اس کا سبب یہ ہے کہ اِنسان کی ظاہری عقل اور باطنی عقل اس کے دو ہاتھ کی طرح ہیں، جب یہ دونوں ہاتھ دین کا کام نہیں کرتے ہیں تو نتیجے کے طور پر ٹوٹ جاتے ہیں، جس سے وہ نافرمان اِنسان بھی رُوحانی طور پر ہلاک ہو جاتا ہے۔

حکمت ۱۸ : سورۂ واقعہ (۷۷-۷۹/۵۶) میں ارشاد ہے: بیشک یہ بڑے رُتبہ کا قُرآن ہے (جہاں) کتابِ مکنون میں ہے، اُس کو بس وہی لوگ چھُوتے ہیں جو پاک ہیں۔ یعنی رُوحِ قرآن جو نُورِ عقل میں ہے، اس کو باطنی ہاتھ سے کوئی نہیں چھُو سکتا ہے، مگر وہ حضرات جو پاک کئے گئے ہیں۔

حکمت ۱۹ : سُورہ توبہ کے اِس فرمانِ خُداوندی کی کئی تاویلیں ہیں، اور اس کی ایک عظیم تاویل یہ ہے: (اے رسُولؐ!) تُم اُن کے اموال سے ایک صدقہ (یعنی باطنی مال سے ایک گوہر) لو اور اس کے ذریعہ ان کو (بدرجۂ اُتم) پاک صاف کرو اور ان کو صلوات دو کیونکہ تمہاری صلوات میں اِنکے لئے تسکین ہے یعنی اِس مقام پر کلمۂ باری سے ان کو فیض پہنچا دو۔

حکمت ۲۰ : خُداوند تعالیٰ کی بارگاہِ عالی سے مومنین پر درُود نازل ہونے کے بارے میں ارشاد ہے: خُدا وہی ہے جو خُود تُم پر درُود بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے بھی تاکہ تُم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے جائے۔ خُدائے سُبحان کی یہ درُود کلمۂ باری کے خزانے سے نازل ہو جاتی ہے جو تائیدی

علم و حکمت کی بنیاد ہوا کرتی ہے۔

حکمت ۲۱ : علم سکھایا بھی جاتا ہے اور دیا بھی جاتا ہے، مگر سکھانے کے مقابلے میں علم کا دیا جانا اعلیٰ ہے، جیسا کہ ارشاد ہے : بَلْ هُوَ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِي صُدُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ (۲۹/۴۹) بلکہ جن لوگوں کو خدا کی طرف سے علم عطا ہوا ہے ان کے دل میں یہ قرآن روشن آیات (یعنی زندہ معجزات کی صورت میں) ہے۔ یہ آیۂ مبارکہ ائمۂ طاہرین صلوات اللہ علیہم کے بارے میں ہے، اس سے یہ حقیقت صاف طور پر ظاہر ہو جاتی ہے کہ ان حضرات کو علم نورِ عقل کی صورت میں دیا جاتا ہے۔

حکمت ۲۲ : سورۂ بنی اسرائیل (۱۷/۷۱) میں ارشاد فرمایا گیا ہے : اُس دن (کو یاد کرو) جب ہم (ہر زمانہ کے) لوگوں کو انکے امام کے ساتھ بلائیں گے تو جس کا نامۂ اعمال اس کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا تو ایسے لوگ (خوش خوش) اپنا اعمال نامہ پڑھنے لگیں گے اور انہیں ریشہ برابر کمی نہیں کی جائے گی۔ سوال ہے کہ آیا یہ کتاب یعنی نامۂ عمل کسی ظاہری تحریر میں ہوگی ؟ عربی ؟ فارسی ؟ اردو ؟ انگریزی وغیرہ ؟ نہیں نہیں، یہ روح اور عقل کی کتاب ہوگی، جسے ہر خواندہ و ناخواندہ بآسانی پڑھ سکے گا، کیونکہ وہ کتاب ناطق ہوگی، یعنی امام زمانؑ کا نور ہوگا۔

حکمت ۲۳ : ہاں یہ حقیقت ہے کہ ہر شخص کو اس کا نامۂ اعمال صرف مر جانے کے بعد ہی مل جاتا ہے، لیکن کیا یہ ممکن نہیں کہ اس

دُنیا میں کچھ لوگ جیتے جی مرجائیں ؛ میرا عقیدہ ہے کہ ہر پیغمبر، ہر امام، اور ہر پیر کے بعد بہت سے عالی ہمّت مومنین بھی اِس جسم میں زندہ رہتے ہُوئے نفسانی موت سے مرجاتے ہیں، اور کتابِ عمل کو حاصل کرکے پڑھتے ہیں۔

حِکمت ۲۴ : سُورۂ بقرہ کی آیت ۹۴ کا اِرشاد ہے : (اے رسُولؐ!) ان لوگوں سے کہدو کہ اگر خُدا کے نزدیک آخرت کا گھر (یعنی بہشت) خاص تمہارے واسطے ہے اور لوگوں کے واسطے نہیں ہے پس اگر تم سچّے ہو تو موت کی آرزُو کرو (۲/۹۴) اِس آیۂ کریمہ میں پیغمبرانہ اور اولیائی موت کا ذکر فرمایا گیا ہے، جس میں جیتے جی نفسانی موت واقع ہوجاتی ہے، اور نتیجے کے طور پر وہ حضرات اپنے اپنے زمانے کی بہشت بن جاتے ہیں، کیونکہ بہشت کے تصوّر کا سب سے عظیم مقصد یہ ہے کہ کوئی بڑی فرمانبردار رُوح بہشت بن جائے، اور جس کو یہ بلند ترین درجہ حاصل ہُوا تو بہشت گویا بطورِ خاص اسی کی ہُوئی، دُوسرے لفظوں میں اِس مطلب کی وضاحت یُوں ہے کہ بہشت کا سب سے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ کوئی مُتّقی شخص بحکمِ خُدا بہشت کا وجُود بن جائے، اور دُوسرے درجات ایسے ہیں کہ لوگ اُن میں داخلِ جنّت قرار پاتے ہیں۔

حِکمت ۲۵ : حصُولِ جنّت کے لئے جس طرح سَارِعُوْا (۳/۱۳۳ جلدی کرو) اور سَابِقُوْا (۵۷/۲۱ سبقت کرو) کا حُکم دیا گیا ہے، اِس سے ایک ہوشمند شخص یہ نتیجہ اخذ کرسکتا ہے کہ بہشت کی شروعات میں

مدارج مقرّر ہیں، اور ان میں سب سے اعلیٰ درجہ انسان کا اپنی ذات میں خود زندہ بہشت بن جانا ہے، جس کی مثال انبیاء و آئمہ صلوات اللہ علیہم کی ذواتِ مقدّسہ ہیں۔

حکمت ۲۶ : نُور پوشیدہ نہیں ظاہر ہے، لیکن کثرتِ انوار کے حجاب میں ہے، جیسے سورج ظاہر تو ہے، مگر ہم اُس سے بہت ہی دُور ہیں، لہٰذا وہ ہمیں اپنی اصل جسامت و مقدار سے بہت ہی چھوٹا نظر آتا ہے، ہم اُس کے باطن کو نہیں دیکھ سکتے، اور نہ پس منظر کو کیونکہ وہ نُورٌ علیٰ نُورٍ (روشنی پر روشنی ہے) کی مثال ہے، اِس کے یہ معنی ہوئے کہ امامِ زمان صلوات اللہ علیہ کا نُورِ عقل نُورِ رُوح کے پردے میں ہے، اور نُورِ رُوح نُورِ شخصیّت کے حجاب میں ہے۔

حکمت ۲۷ : قرآنِ حکیم میں جہاں کہیں بھی خُدا کے بابرکت ہاتھ کا ذکر فرمایا گیا ہے، اِس سے وہی مُبارک ہاتھ مُراد ہے، جس کا تذکرہ آیۂ بیعت (۴۸/۱۰) میں موجُود ہے، اور کوئی بھی مومن اِس قانونِ خُدائی کو بھُول نہ جائے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی عظیم الشّان چیز کو اپنی ذاتِ اقدس سے خصُوصی نسبت دیتے ہُوئے فرماتا ہے کہ یہ چیز میری ہے، تو وہ شئے لازوال اور غیر فانی ہو جاتی ہے، اور کبھی دُنیا سے غائب نہیں ہو سکتی، جیسے خُدا کی کتاب (قرآن)، خُدا کی رسّی، اِس کا نُور، اِس کا گھر (خانۂ کعبہ)، خُدا کا دین (اِسلام)، شعائرُ اللہ، خُدا کی نشانیاں، آفاق و انفس میں اُس کی آیات، وغیرہ، پھر یہ کیسے ممکن

ہو سکتا ہے کہ یدُ اللہ کبھی موجُود ہو اور کبھی غیر موجُود، اِس روشن دلیل سے ہمارے یقین کو بیش از بیش تقویت مل جاتی ہے کہ رسُولِ کریمؐ کے برحق جانشین (یعنی امامِ زمانؑ) کو دستِ خُدا ہونے کا درجہ حاصل ہے۔ الحمدُ للہِ ربّ العالمین۔

خاکِ پائے جماعت

نصیر الدّین نصیر ہونزائی

لندن

۲۹ر جُون سنہ ۱۹۸۴ء

نامۂ اعمال

قرآنِ حکیم کے انتہائی اہم اور عظیم الشان موضوعات میں سے ایک موضوع "نامۂ اعمال" ہے، اِس کی اہمیت کے کئی اسباب ہیں، اور اُن میں سے ایک خاص سبب یہ ہے، کہ اِس میں رُوحانیت کا بیان بطریقِ حکمت عام و خاص جملہ اِنسانوں کی سطح پر فرمایا گیا ہے، جس کی وجہ سے رُوحانی حقیقتوں کا تصوّر بہت آسان ہو گیا ہے، جیسا کہ ارشادِ خُداوندی ہے :-

وَكُلَّ اِنسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ط وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا ۔ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ط كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا (۱۷/۱۳-۱۴) اور ہم نے ہر انسان کے نامۂ اعمال کو اس کی گردن میں لگا رکھا ہے اور قیامت کے دن ہم اسے یہ اعمال نامہ نکال دیں گے جو اس کو ایک بکھری ہوئی کتاب (کی صورت میں) ملے گا، اپنا نامۂ اعمال پڑھ لے اور اپنا حساب لینے کے لئے تو خود ہی کافی ہے۔

انسان کی گردن سے اس کا مذہبی پیشوا مُراد ہے، خواہ حق ہو یا باطل، اعمال نامہ کو "طائر" کہنے کی خاص وجہ یہ ہے کہ وہ اُڑ کر آتا ہے، کیونکہ وہ اُڑتے ہُوئے ذرّاتِ لطیف پر مبنی ہے، اور اسی سبب سے اس کا نام کتابِ منشور (بکھری ہُوئی کتاب) ہے، جس کا ہر ذرّہ بولتا ہے۔

فرمانِ خُداوندی ہے: فمن یّعمل مِثقال ذرّۃٍ خیراً یّرہٗ، وَمن یّعمل مِثقال ذرّۃٍ شرّاً یّرہٗ (۹۹/۷-۸) سو جس شخص نے ذرّہ برابر نیکی کی تو وہ اسے دیکھ لے گا، اور جس شخص نے ذرّہ برابر بدی کی ہے تو اُسے دیکھ لے گا یعنی آدمی کے اعمالِ نیک و بد ذرّات کی صُورت میں ہونگے، اور قیامت اگرچہ اسی دُنیا میں برپا ہوگی، لیکن دیکھنے والے کے سامنے عالمِ ذرّ ہوگا، اِس معنٰی میں کہ وہ اپنے ظاہر و باطن میں رُوح کے ذرّات ہی ذرات کو دیکھے گا۔

سُورۂ کہف (۱۸/۴۹) کا ارشاد ہے: وَوَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِراً (۱۸/۴۹) اور جو کچھ (اچھا یا بُرا) ان لوگوں نے کیا تھا وہ سب (زندہ فلم ریکارڈ کی صُورت میں) موجُود حاضر پائیں گے۔ اِس آیۂ کریمہ کے لفظِ "حاضر" میں رُوحانیت کی اُس زندہ اور شعوری عکاسی (تصویر کشی) کا ذکر پوشیدہ ہے، جس سے اِنسان کے اعمال کسی کمی کے بغیر ریکارڈ کئے جاتے ہیں، جس کی ایک چھوٹی سی مثال اِس مادّی دُنیا میں فلم ریکارڈ ہے، کیونکہ اِس کے بغیر کسی بھی عمل کا محض تحریری لفظوں میں حاضر ہونا ممکن نہیں، چُنانچہ جس نے جو کچھ عمل کیا ہے، اس کی زندہ اور بولنے والی تصویر سامنے آئے گی، یہاں تک کہ اس میں زمان و مکان اور ماحول کی

ہر چیز بھی ہوگی، اور اگر اس کے اچھے یا بُرے عمل کا تعلق کسی علاقے یا کسی ملک سے ہے، تو وہ بھی مکانی طور پر نتائج کی جیتی جاگتی اور بولتی تصویروں میں سامنے آئے گا۔

نتیجۂ عمل کا تعلق نہ صرف جسم اور ظاہری دُنیا سے ہے، بلکہ یہ رُوح اور عقل سے بھی متعلق ہے، لہٰذا کتابِ اعمال میں تین قسم کے مشاہدے ہوں گے، یعنی جسمانی، رُوحانی، اور عقلی اعمال کا مُشاہدہ کرنا، اور اگر یہ حقیقت نہ ہوتی تو قُرآنِ کریم یہ ترجمانی نہ کرتا کہ: مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَّلَا كَبِيرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا (۱۸/۴۹) یہ کیسی کتاب ہے کہ نہ کوئی چھوٹی چیز فروگذاشت کرتی ہے اور نہ بڑی چیز مگر اس نے ہر چیز کو محدود کر لیا ہے۔

اعمال ناموں کا بُنیادی تعلق دین، مذہب، اور مسلک کے افراد سے ہے، لہٰذا سب سے بڑے مجموعی اعمال نامے اُمتوں سے متعلق ہوں گے، جیسا کہ قولِ قُرآن ہے: كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰٓى اِلٰى كِتٰبِهَا (۴۵/۲۸) ہر اُمت اپنے نامۂ اعمال کی طرف بُلائی جائے گی۔ یعنی ہر عظیم پیغمبر کا نوری وجود اپنے جانشینوں کے توسّط سے پُورے دَور کے لوگوں پر چھایا ہُوا ہوتا ہے لہٰذا کتابِ اعمال کے معنی میں اِسی مُبارک ہستی کی طرف اُمت کو بُلایا جائے گا، جیسا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ط اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۴۵/۲۹) یہ ہماری کتاب (جس میں تم سب کے اعمال درج ہیں) تمہارے مقابلہ میں سچ سچ بول رہی ہے جو

کچھ بھی ہم کرتے تھے ہم لکھواتے جاتے تھے۔ بولنے والی کتاب سے نُور مراد ہے، جو نبوّت و امامت کی مرتبت میں بولنے کا حقدار ہے، یہاں بطورِ اعمال نامہ کے بولنا گواہی کے معنی میں ہے، اور انسان کے احوال و اعمال ایسے ہیں کہ وہ جسمانی، رُوحانی، اور عقلی حدُود میں پھیلے ہوئے ہیں، اِس لئے اُن پر محیط ہوکر کوئی چیز شہادت (گواہی) نہیں دے سکتی ہے، مگر نُورِ ہدایت جو جسم، رُوح، اور عقل پر مبنی ہے، اور وہ خُدا کی جانب سے اہلِ زمانہ پر فرشتۂ نگران کے معنوں میں مقرّر ہے۔

اِسی کتابِ نُورانیت کے بارے میں یہ بھی ارشاد ہے: وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (۲۳/۶۲) اور ہمارے پاس تو (لوگوں کے اعمال کی) کتاب ہے جو بالکل ٹھیک حال بتاتی ہے اور ان لوگوں کی (ذرّہ برابر) حق تلفی نہیں کی جائے گی۔ يَنْطِقُ بِالْحَقِّ کی تاویل ہے: نُورِ عقل کی زبان سے بولتی ہے، کیونکہ "حق" نُورِ عقل کے ناموں میں سے ہے۔

سُورۂ تطفیف (۸۳/۷-۹) میں ارشاد فرمایا گیا ہے: كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ۔ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ (۸۳/۷-۹) سُن رکھو بدکاروں کا نامۂ عمل سِجّین میں ہے اور تُم کو کیا معلوم کہ سِجّین کیا چیز ہے، ایک لکھی ہُوئی کتاب ہے۔ سِجّین پیشوائے باطل ہے، اور وہ ایک باطل کتاب کی صُورت میں ہے، چُنانچہ فُجّار کا اِجتماعی نامۂ اعمال سِجّین کی تنگیوں میں مقیّد و محبوس ہے۔

اِسی سُورہ میں یہ بھی ارشاد ہُوا ہے: كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ

لفی عِلِّیِّیْنَ ط وَمَا اَدْرٰکَ مَا عِلِّیُّوْنَ کِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ یَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ (۸۳/۱۸-۲۱) سُن رکھو کہ نیکوں کا (اجتماعی) نامۂ عمل علّیین میں ہے، اور تم کو کیا معلوم کہ علّیون کیا ہے وہ ایک لکھی ہوئی کتاب ہے، اس کے پاس مقرّبین حاضر ہوتے ہیں۔ علّیین پیشوائے برحق ہے، جس کا مرتبہ بہشتِ برین کی انتہائی بلندی پر ہے، اور اسی کے نورِ اقدس میں نیکوکاروں کا اجتماعی نامۂ اعمال موجود ہے، وہ حق و صدق کی زندہ اور بولنے والی کتاب ہے، جس کے باطنی پہلو کا مشاہدہ نہ صرف آخرت میں ہوجاتا ہے، بلکہ اِس دُنیا میں بھی ممکن ہے۔

کتابِ اعمال یا نامۂ اعمال کے دیئے جانے کے اعتبار سے لوگ تین قسم کے ہوں گے، اصحابِ یمین، جو داہنے ہاتھ میں نامۂ عمل لیں گے، اصحابِ شمال، جن کے بائیں ہاتھ میں یہ نامہ ہوگا، اور سابقون، جن کے سامنے سے یہ کتاب آئے گی، یہ لوگ سب سے آگے اور سب سے اعلیٰ درجے پر فائز ہوجائیں گے، ان کے نامۂ اعمال کا خاص تعلق نورِ عقل سے ہوگا، لہٰذا وہ حضرات مقرّبین کہلائیں گے، انکے بعد اصحابِ یمین ہوں گے، جو اہلِ نجات ہیں، ان کی کتابِ عمل کی رسائی رُوح تک ہوگی، اور وہ بتدریج منازلِ رُوح کو طے کرتے ہوئے آگے بڑھیں گے، اور سب سے آخر میں اصحابِ شمال ہوں گے جن کا نامۂ اعمال صرف ظاہر اور جسم تک محدود ہوگا، جبکہ اصحابِ یمین باطن اور رُوح تک اور سابقون باطن کے باطن اور نورِ عقل تک رسائی کرچکے ہوں گے، پس بائیں ہاتھ کی تاویل ظاہر ہے،

جہاں جسم ہے، داہنے ہاتھ کی تاویل باطن ہے جہاں رُوح ہے، اور آگے کی تاویل باطن کا باطن ہے، جہاں نورِ عقل کی جلوہ گاہ موجود ہے، جیسا کہ فرمایا گیا ہے :-

یَوْمَ تَرَی الْمُؤمِنِینَ وَالْمُؤمِنَاتِ یَسْعٰی نُورُھُمْ بَینَ اَیدِیھِم وَبِاَیمَانِھِم (۵۷/۱۲) جس دِن تُم مومن مردوں اور مومنہ عورتوں کو دیکھو گے کہ اُن کا نُور اُن کے آگے اور داہنی طرف دوڑ رہا ہوگا۔ یہ نُورِ حقیقی نُور ہی ہے اور سابقین و مقربین کا نامۂ اعمال بھی، اِس کا عقلی سفر گول ہے، اس کے دوڑنے کی تاویل ہے، اور وہ یہ کہ یہاں کا ایک نُوری دن جو صرف چند سیکنڈوں کا ہوتا ہے، وہ دُنیا کے ہزار سالہ واقعات کو اپنے اندر سمالیتا ہے۔

دُوسری آیۂ کریمہ کا ترجمہ ہے کہ : اُس دن منافق مرد اور منافق عورتیں ایمانداروں سے کہیں گے ذرا ٹھہرو کہ ہم بھی تمہارے نُور سے چنگاری لیں (اور اپنے اندر اسے نُور بنائیں) تو کہا جائے گا کہ تُم اپنے پیچھے (سلسلۂ ماضی میں) لوٹ جاؤ اور (وہیں) ایک نُور کی تلاش کرو، پھر ان (مومنین اور منافقین) کے درمیان ایک دیوار کھڑی کردی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہوگا (اور) اس کے اندر کی جانب تو رحمت ہے اور باہر کی طرف عذاب (۵۷/۱۳) یہ تذکرہ انفرادی قیامت کا ہے، جو ہر زمانے میں اِنسانِ کامل کے رُوحانی عرُوج کے ساتھ ساتھ برپا ہوجاتی ہے، جس میں عالمِ ذرّ سامنے ہوتا ہے اور بصورتِ ذرّات سب لوگ حاضر ہوتے ہیں، اور

ان کا سارا قصہ بطریق حکمت زبان حال میں ہوتا ہے، یعنی یہ ان کی شعوری قیامت نہیں ہوتی، جس طرح واقعہ "الست" اپنی جگہ ایک وجدانی حقیقت ہے، لیکن یہ عالم ذر کی بات ہے، اس لئے یہ کسی کو یاد نہیں، چنانچہ مومنوں اور منافقوں کے درمیان دیوار قائم کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ایک مقررہ وقت کے بعد ذرات روح کو مقام قیامت سے ہٹا دیا جاتا ہے، اور دونوں کے درمیان مثال کی دیوار بنائی جاتی ہے۔

قرآن حکیم میں طرح طرح کی لاتعداد حکمتیں پوشیدہ ہیں، ان میں سے ایک حکمت یہ بھی ہے کہ قرآنی الفاظ کے آپس میں معنوی اور تاویلی رشتے ہوتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ کی اس پر حکمت کتاب میں اکثر ضرب اور ضرب مثال بنانے یا بیان کرنے کے لئے آتا ہے، لہٰذا فَضُرِبَ بَيْنَهُم بِسُوْرٍ کے معنی ہیں انکے درمیان مثال کی دیوار بنائی گئی، جس کے اندر کی طرف تو رحمت ہے اور باہر کی طرف عقل کی مشقتیں ہیں، اور اس دیوار میں ایک دروازہ ہے، جس سے اصول تاویل مراد ہے تاکہ جن سے ہو سکے تو وہ اس کے ذریعے سے ظاہر سے باطن میں اور مثال سے ممثول میں داخل ہو جائیں۔

ضَرْبٌ (مارنا) سے ضَرَبَ (مارا) ہے، لیکن کوئی لغات آپ کو اس کی وجہ نہیں بتا سکے گی کہ قرآن حکیم ایسی حکمت کی کتاب میں مثال بیان کرنے کے لئے کیوں ضَرَبَ کا لفظ استعمال ہوا ہے، حالانکہ اس کے اصل معنی مارنے کے ہیں، مگر اس کی وجہ تاویل ہی کی روشنی میں

معلوم ہوگی، اور وہ یہ ہے کہ ضَرَبَ چونکہ ہاتھ کا فعل ہے اِس لئے اس میں دستِ خُدا کی طرف اشارہ ہے کیونکہ وہی ہاتھ گوہرِ عقل کے ضرب سے گوناگون مثالیں بناتا ہے۔

خاکپائے عزیزان

نَصِیر الدّین نَصِیر ہونزائی

لندن

۲/ جولائی سنہ ۱۹۸۴ء

ISW
Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

عقلی بہشت کی نعمتیں

سب سے پہلے وجودِ بہشت کے بارے میں جاننا چاہئے کہ وہ جسمانی، رُوحانی، اور عقلی تین حیثیتوں میں موجود ہے، اور اِس تصوّر کی ایک روشن دلیل اِنسان کی ہستی سے پیش کی جاسکتی ہے کہ وہ جسم، رُوح، اور عقل کا مجمُوعہ ہے، جبکہ اِنسان نمونۂ تخلیق اور خلاصۂ موجُودات ہے، اِنسان کی ہستی سے بہشت کی مثال دینا اِس لئے بھی ضروری ہے کہ بہشت اِنسان کے جسمانی، رُوحانی، اور عقلی تقاضوں کے مطابق بنائی گئی ہے، اِس لئے وہ جسم و جان اور عقل کے اعلیٰ اور حقیقی اوصاف میں زندہ، گوئندہ اور دانا ہے، جیسا کہ خُداوندِ عالم کا ارشاد ہے :-

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ط وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (۲۹/۶۴) اور یہ دُنیاوی زندگی تو کھیل تماشے کے سوا کچھ نہیں، اور اگر یہ لوگ علم کی روشنی میں دیکھیں تو اس میں شک نہیں کہ آخرت کا گھر ہی حقیقی حیات (اور زندہ) ہے۔ اگرچہ لفظِ حَیَوَانٌ اور حَیْوَانٌ میں فرق ہے، تاہم

جس طرح قرآن سات حروف پر نازل ہوا ہے اس کے اصول کے مطابق یہاں اس حقیقت کی طرف ایک بلیغ اشارہ فرمایا گیا ہے کہ آخرت کا گھر زندہ ہے اور وہ انسانی صورت میں ہے، کیونکہ اس آیۂ کریمہ میں جس طرح انسان کی دنیوی زندگی پر اُخروی زندگی کو بدرجۂ انتہا ترجیح دی گئی ہے، اور اس سلسلے میں جس اندازِ حکمت سے لفظِ "حیوان" میں بہشت کی تعریف و توصیف کی گئی ہے، اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ بہشت ایک انتہائی عظیم اور کامل و مکمل شخصیت کی طرح ہے۔

ہمیں اللہ تعالیٰ کے اس فرمانِ اقدس میں خوب غور کرنا چاہئے، جو سورۂ تکویر (۸۱/۱۱) میں ہے: وَاِذَا السَّمَآءُ کُشِطَتْ (۸۱/۱۱) اور جس وقت آسمان کا چھلکا اُتارا جائے گا۔ آسمان سے کائنات و موجودات کی ہر ہر چیز مُراد ہے، چُنانچہ قیامت کے دن آسمانوں، زمین اور ان کی تمام چیزوں کو چھیل کر کثیف سے لطیف بنایا جائے گا، پھر اس وقت یہ کائنات اپنی ساری چیزوں کے ساتھ جسمانی بہشت کی صورت میں سامنے ہوگی، اس حال میں عالمِ انسانیت لازمی طور پر جسمِ لطیف میں ہوگا، اور آپ کو یاد ہوگا کہ فرمودۂ قرآن کے بموجب جسمانی بہشت اس کائنات کے طُول و عرض کے برابر ہے (۳/۱۳۳، ۵۷/۲۱) پس یہ جسمِ مثالی کی جنّت ہے، جو ابداعی جسم ہے، جس میں ارادۂ کُن کے تحت سب کچھ موجود ہے، اور اس کائنات کی رُوح (عالمگیر رُوح) رُوحانی بہشت ہے۔

کائناتی رُوح کے بہت سے نام ہیں، اور اس کا ایک قرآنی نام کُرسیِّ خُدا ہے، جس میں بہشتِ رُوحانی ہے، جیساکہ فرمایا گیا ہے:۔
وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (۲/۲۵۵) اُس کی کُرسی سب آسمانوں اور زمینوں کو گھیرے ہوئے ہے۔ پس رُوحِ اعظم خُدا تعالیٰ کی کُرسی بھی ہے اور رُوحوں کی جنّت بھی، جس میں ہر طرح کی رُوحانی نعمتیں مُہیّا ہیں۔

رُوحِ اعظم جہاں کُرسی اور رُوحانی بہشت ہے، وہاں عقلِ کامل عرش اور عقلی بہشت ہے، مگر اِس جگہ یہ نکتہ یاد رہے کہ عقل کا قرآنی تصوّر ایسا ہے کہ وہ زمان و مکان کی تمام مُسافتوں کو ختم کر کے جُملہ اشیاء کو ازلی و ابدی وحدت میں سما دیتا ہے، چُنانچہ کائنات جس طرح اپنی ظاہری صُورت میں پھیلی ہُوئی ہے، اِسی طرح باطنی صُورت میں مقامِ عقل پر محدُود و مرکوز ہو جاتی ہے، جیسے قُرآنِ حکیم میں ہے: يَوْمَ نَطْوِي السَّمَاءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ط كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ (۲۱/۱۰۴) اُس دِن ہم آسمان (یعنی جُملہ کائنات) کو اس طرح لپیٹیں گے جس طرح خطوں کا طومار لپیٹا جاتا ہے، جس طرح ہم نے (مخلوقات کو) پہلی بار پیدا کیا تھا (اسی طرح) دوبارہ (پیدا) کریں گے۔ سِجِلّ کے معنی میں اختلاف ہے، ہمارے نزدیک یہ لفظ سجّیل کی طرح ہے جو سنگِ گِل کا مُعرّب ہے، یعنی ایسی مٹّی کی سخت گولی جس سے لکھنے کا کام لیا جاتا تھا، اِس کا مفہوم روشنائی کا قرص ہے، یاد رہے کہ قُرآنی مثالوں میں جیسے الفاظ اِستعمال ہُوئے ہیں، ان کی ایک

خاص وجہ تاویلی حکمت ہے، بہرحال اِس آیۂ کریمہ میں تصوّرِ عقل کا تذکرہ فرمایا
ہے، جو عقلی بہشت کا تصوّر ہے، جس میں علم و حکمت کی ہر چیز اور ہر نعمت موجود
ہے، جیساکہ فرمودۂ قرآن ہے :-

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ (۶۸/۱) قسم ہے دوات کی اور قلم کی اور
اس چیز کی جو لکھتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ تصوّرِ عقل کی قسم کھاتا ہے، جو کائنات
کا جوہر ہے، جس میں عقل کی دوات، قلم اور تحریر کی ہر چیز موجود ہے
کیونکہ اسی سے بہشت کی عملی تحریر بنتی ہے اور اسی سے کائناتِ ظاہر
و باطن کا وجود بن جاتا ہے۔ اِس آیۂ کریمہ کی ایک بنیادی تاویل بھی ہے
اور وہ یہ ہے : قسم ہے دہنِ مبارک جو مثلِ اعلیٰ کے مطابق حکمت کی دوات
ہے، اور قسم ہے نورِ عقل کی جو قلمِ الٰہی ہے، اور قسم ہے اُس چیز کی جو
اِس دوات و قلم سے بزرگ فرشتے لکھتے ہیں، یعنی کلمۂ باری۔

مٹّی کی تاویل مومن ہے، اور ایسی خاص قسم کی مٹّی جو پتھر کی طرح
ٹھوس ہو چکی ہے اور جو سنگِ گِل یا سنگِ سجّیل کہلاتی ہے وہ راسخ العقیدت
مومن ہے، کیونکہ ایسے مومن کے دو پہلو ہوا کرتے ہیں، یعنی وہ عقیدے
کے اعتبار سے بڑا سخت ہوتا ہے، مگر حقیقی علم کے معاملے میں حد
سے زیادہ نرم دِل ہوتا ہے، جیسے سنگِ گِل کہ وہ سخت بھی ہے اور
دوات میں ڈال کر اُس پر پانی ڈالنے سے حل ہو کر لکھنے کے قابل
بھی ہو جاتا ہے۔

سُورۂ فیل (۱۰۵/۱-۵) میں غور کرنا چاہیئے، کہ اللہ تعالیٰ نے ہاتھی

والوں کو کسی اور پتھر سے نہیں بلکہ سجّیل (سنگِ گل) کی کنکریوں سے ہلاک کر دیا، اِس میں بہت بڑا راز ہے، اور وہ یہ ہے کہ خانۂ کعبہ جس طرح ظاہر میں مادّی طور پر موجُود ہے، اِسی طرح باطن میں رُوحانی حیثیت میں اُس کا وجُود ہے، اور جیسے اہلِ باطل نے بحالتِ جسمانی ایک بار خُدا کے ظاہری گھر کو مٹانے کے لئے کوشش کی تھی ایسے وہ بہ کیفیّتِ رُوحانی ہر بار اللہ کے باطنی گھر کو مٹانے کی سعی کرتے ہیں، یعنی وہ بشکلِ ذرّات ایک خاص وقت میں انسانِ کامل پر حملہ آور ہو جاتے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ اپنے پاک نُورانی گھر کی حفاظت کے لئے فرشتوں کا ایک لشکر بھیجتا ہے، جس کے ذریعے سے راسخ العقیدہ اور جان نثار مومنین و مومنات کے ذرّاتِ ارواح کی کنکریاں برسا کر خانۂ خُدا کے دُشمنوں کو تباہ کیا جاتا ہے۔

سُورۂ ہود (۱۱/۸۲) اور سورۂ حِجر (۱۵/۷۴) میں فرمایا گیا ہے کہ حضرت لُوط علیہ السّلام کی نافرمان قوم کی بستی کو زیر و زبر کر کے اُس پر سجّیل کی تہ برتہ کنکریاں برسائی گئی تھیں، اس کا تاویلی پہلو یہ ہے کہ انسانِ کامل کے عالمِ شخصی میں بھی ایک ایسا واقعہ پیش آیا تھا، یعنی وہ نافرمان لوگ رُوحانی طور پر ہلاک کئے گئے تھے، اور اِس خُدائی طاقت میں ارواحِ مومنین کو شرکت دی گئی تھی، اور اس میں لفظِ سجّیل سے متعلق ایک خاص بات "تہ برتہ" ہے، جس کی تاویل ہے ایک مومن کی رُوح میں بہت سی ارواح کا ساتھ ہونا۔

ارشاد ہے: اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِیْنَ۔ وَاِنَّهَا

لَبِسَبِيْلٍ مُّقِيْمٍ (۱۵/۷۵-۷۶) اِس میں شک نہیں کہ اِس واقعہ میں (اصلی بات کے) تاڑ جانے والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ یعنی حضرتِ پیغمبر اور حضرتِ ائمہ صلوات اللہ علیہم جانتے ہیں کہ اِس میں رُوحانی معجزات کا ذکر ہے۔ اور وہ اُلٹی ہُوئی بستی ہمیشہ کے راستہ پر ہے۔ یعنی راہِ رُوحانیّت پر اِس معجزے کا مُشاہدہ ہو جاتا ہے۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ (۱۵/۷۷) بیشک اِس میں مومنین کے لئے معجزہ ہے۔ مُتوسّمین کے لئے اس میں بہت سی آیات ہیں اور مومنین کے لئے ایک آیت ہے، اِس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ یہاں جن مومنین کا ذکر ہے اُن سے مُتوسّمین ممتاز اور اعلیٰ ہیں، جن کا اُوپر ذکر ہو چکا ہے۔

دُنیا کی نعمتیں ایسی ہیں کہ ان کی تلاش میں بہت سی مُسافتیں طے کرنا پڑتی ہیں، اِس کے برعکس عقلی اور رُوحانی نعمتیں بشرطِ علم و عمل مومنین کے سامنے آتی ہیں، اور یہ سب کچھ عقلی بہشت کی بدولت ہے، جو بہت سے عظیم ناموں اور اعلیٰ مثالوں کے ساتھ قبضۂ قُدرت میں ہر وقت موجُود ہے، مثال کے طور پر خُداوند تعالیٰ کا یہ فرمانِ اقدس کہ: جس (خُدا) کے قبضہ میں بادشاہت ہے وہ بڑی برکت والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے (۶۷/۱) اِس کی تاویلی حکمت یہ ہے کہ حقیقی بادشاہی کی تمام برکتیں جو وسیع و عریض کائنات اور سارے زمانوں میں پھیلی ہُوئی ہیں وہ نورِ عقل میں مرکوز اور مجموع ہیں، اور یہ وہ بہشت ہے جو دُور و دراز ہونے کے باوجُود نزدیک لائی گئی ہے،

جیساکہ قرآنِ حکیم میں ہے :-

وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ غَيْرَ بَعِيْدٍ (۵۰/۳۱) اور بہشت پرہیزگاروں کے بالکل قریب کردی جائے گی۔ یعنی کائنات کے طول و عرض میں جس طرح بہشت اور باطنی سلطنت مبسوط ہے، اس کو عقلِ کُل کے جوہر میں پیش کیا جائے گا، جس میں ہر زمانے کے عقلی اور علمی جواہر موجود ہیں، اِسی معنیٰ میں قرآن کا یہ ارشاد ہے :-

اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرَاتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۲۸/۵۷)

کیا ہم نے انہیں حرمِ مکّہ میں جہاں ہر طرح کا امن ہے جگہ نہیں دی جہاں ہر قسم کے پھل روزی کے واسطے ہماری بارگاہ سے کھنچے چلے جاتے ہیں مگر اُن میں سے اکثر نہیں جانتے۔ یہ امامِ زمان صلوات اللہ علیہ و سلامہ کا نُور ہے، جو حُرمت اور امن کا مقام ہے، جس میں خُداوند تعالیٰ کا سب سے اصلی اور اساسی معجزہ یہ ہے کہ اوّل و آخر اور ظاہر و باطن کی تمام چیزوں کے عقلی، علمی اور رُوحانی پھل ہر جگہ اور ہر زمانے سے کھنچ کھنچ کر اس میں سما جاتے ہیں، تاکہ اِسی طرح اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ عالی سے یہ رزق اہلِ معرفت کو ملتا رہے، یہ سوچنے کی بات ہے کہ اِس عالمِ ظاہر میں ثَمَرَاتُ كُلِّ شَيْءٍ (تمام چیزوں کے پھل) کہاں ہوتے ہیں؟ اور یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آسمان و زمین کی ہر ہر چیز میں پھل لگے؟ مگر ہاں ہر چیز میں اپنی نوعیت کی ایک رُوح پوشیدہ ہے اور ایک علم پنہاں، جیسے

حاملانِ عرش نے کامل معرفت کی روشنی میں کہا: رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا (۴۰/۷) پروردگارا! تُو نے ہر چیز کو ایک رحمت اور ایک علم میں سمار کھا ہے۔ چنانچہ ہر چیز سے متعلق دو تصوّر قائم ہو گئے، ایک رحمت کا اور دُوسرا علم کا، یا یُوں سمجھ لیں کہ اس مقام پر ہر چیز گویا ایک درخت ہے، اور اس کے وجُود کے مطابق جو رحمت (مہربانی) ہے وہ اس کا پھل (رُوح) ہے، اور جو اس کی علمی کیفیّت و صُورت ہے، وہ اِس پھل کا مغز ہے، پس بحکمِ خُدا ہر چیز کا پھل رُوحانی اور علمی طور پر خانۂ خُدا میں پہنچ جاتا ہے۔

قُرآنِ حکیم میں جن نعمتوں کا ذکر فرمایا گیا ہے وہ سب سے پہلے اور سب سے اعلیٰ مقام پر عقلی بہشت کی نعمتیں ہیں، پھر رُوحانی ہیں اور اس کے بعد جسمِ لطیف کی نعمتیں ہیں، اور جسمِ لطیف کی غذاؤں کی ایک قُرآنی مثال یہ ہے کہ حضراتِ انبیاء و اولیا کو اور بوقتِ ضرورت بعض مومنین کو بھی لطیف جسمانی کھانوں کا تجربہ ہو جاتا ہے، جس کا عنوان قُرآنِ پاک میں منّ و سلویٰ طیّبات وغیرہ ہے جیسا کہ سُورۃ مومنون (۲۳/۵۱) میں ارشاد ہے:-

يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا (۲۳/۵۱)

اے پیغمبرو! پاک و پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور اچھے اچھے کام کرو۔ اور اگر یہ طیّبات ان چیزوں میں سے ہوتیں جنہیں عوام بھی کھا سکتے ہیں تو اُس صُورت میں پیغمبروں کو باندازِ احسان یہ مخصُوص حُکم نہ ہوتا، اس

سے یہ حقیقت ظاہر ہوجاتی ہے کہ یہ جسمِ لطیف کی غذائیں ہیں، چنانچہ یہ غذا دو قسموں میں ہوتی ہے: رُوحِ نباتی، اور رُوحِ حیوانی، ہر نبات کی رُوح ایسی خُوشبُو میں آتی ہے، جو کم و بیش اُس نبات میں پائی جاتی ہے، جیسی کسی پھُول کی یا کسی جڑی بُوٹی کی یا کسی پھل کی خُوشبُو، ان میں کچھ مانوس اور کچھ غیر مانوس خُوشبوئیں ہُوا کرتی ہیں، اور رُوحِ حیوانی البتہ حلال پرندوں کی ہوتی ہے۔

اِنسانی ذات کی معرفت اتنی اہم اور عظیم ہے کہ یہ آگے چل کر ربِّ کریم کی معرفت ہوجاتی ہے، ایسے حال میں خزائنِ الٰہی کی معرفت الگ نہیں ہوسکتی، جیسے قلم، لوح، فرشتہ، رسُولؐ، امامؑ، اور دُوسرے حقائق، مگر یہاں کوئی شخص شاید یہ سوال کرے گا کہ قُرآنِ مقدّس میں ہزاروں اہم چیزوں کا ذکر ہے، اُن سب کی جُدا جُدا معرفتیں کیسے ممکن ہوسکتی ہیں؟ اِس کا مختصر سا جواب یہ ہے کہ قُرآنِ حکیم میں دراصل بہت سی چیزوں کا ذکر نہیں ہے، بلکہ ہر مثال میں صرف ایک ہی حقیقت و وحدانیت کا بیان ہے، اور اس سلسلے کی سب سے بڑی اور اہم ترین مثال یہ ہے کہ کائناتِ موجودات کی لاتعداد چیزیں خُدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ازلی و ابدی طور پر ایک ہیں، جیسے کتابِ حکیم میں فرمایا گیا ہے:-

وَالْاَرْضُ جَمِیْعًا قَبْضَتُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِیّٰتٌۢ بِیَمِیْنِهٖ (۳۹/۶۷) اور قیامت کے دن ساری زمین اس

کی مٹھی میں ہوگی اور سارے آسمان اس کے داہنے ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہونگے۔ یہاں یہ نکتہ خوب یاد رہے کہ یہ امر واقعی ازل ہی سے ایسا ہے، اور خدا تعالیٰ نے در حقیقت اپنا کوئی ناکردہ کام مستقبل پر نہیں چھوڑا ہے، اور نہ اس کا ماضی اور مستقبل ہے، اس لئے آپ یقین کریں کہ یہ نورِ عقل کا ذکر ہے، جو دستِ خدا میں ہے، جس میں آسمان و زمین ایک ہی روشنی ہے، جیسے سورۃ انبیاء (۲۱/۳۰) میں ارشاد ہوا ہے :-

اَوَلَم یرَ الَّذین کفروا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالاَرضَ کانتا رتقاً ففتقنٰھما ط وَجَعَلنَا من الماءِ کُلَّ شیءٍ حَیٍّ ط افلا یُؤمنون (۲۱/۳۰) جو لوگ کافر ہو بیٹھے کیا انہوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ آسمان اور زمین دونوں ملے ہوئے تھے تو ہم نے دونوں کو شگافتہ کیا، اور ہم ہی نے ہر چیز کو پانی سے زندہ کیا۔ یہ عالمِ شخصی کا تذکرہ ہے کہ وہاں صرف ایک ہی نور ہوتا ہے، جس کے ہزاروں نام ہیں، جس میں آسمان و زمین یعنی کُل کائنات ایک ہے، چنانچہ خداوند تعالیٰ نے اس گوہرِ نور کو حرکت میں لایا، جس سے آسمان و زمین الگ الگ پیدا ہو گئے، اگرچہ اصل نور میں کوئی کمی یا کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، یعنی کائنات اب بھی نور میں آسمان و زمین کے فرق کے بغیر ایک ہی ہے، اور پانی سے ہر چیز زندہ کرنے کی تاویلی حکمت یہ ہے کہ خدا نے اسی نورِ عقل کے علم سے عالمِ شخصی کی ہر ہر چیز میں عرفانی روح ڈالی۔

جیساکہ آپ جانتے ہیں کہ قرآن کریم کی بعض سورتوں کے آخر میں بڑے بڑے بھیدوں کی طرف اشارہ ہوتا ہے، چنانچہ سورۂ قصص (۲۸/۸۸) کے آخر میں فرمایا گیا ہے: كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ ۚ لَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (۲۸/۸۸) چہرۂ خدا کے سوا ہر چیز فنا ہو جانے والی ہے، حکم (امر) اسی کا ہے اور تم لوگ اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ یعنی جہاں کائنات و موجودات قبضۂ خدا میں ایک نور ہیں (۳۹/۶۷) وہاں ہر چیز ہلاک ہو چکی ہے، اور اسی مقام پر دیدارِ خداوندی ہے، اور کسی شخص کی انفرادی فنا یہ ہے کہ وہ اس باطنی حقیقت کا مشاہدہ کرے، مگر جیتے جی نفسانی موت کا مزہ چکھنے کے بغیر یہ مشاہدہ کیسے ہو سکتا ہے۔

دنیا کی چیزیں اعلیٰ اور ادنیٰ دو قسم کی ہوا کرتی ہیں، جب اعلیٰ چیزیں فنا ہو جاتی ہیں تو وہ اعلیٰ سے اعلیٰ تر ہو جاتی ہیں، جس کی ایک مثال یہ ہے کہ ان میں سے بعض کے جلانے سے یا تو روشنی بن جاتی ہے یا خوشبو یا طاقت وغیرہ، اور بعض چیزیں ایسی ہیں جو نباتات، حیوانات اور انسانوں کی غذا بن جاتی ہے، اور دونوں صورتوں میں ان چیزوں کی ترقی و بہتری ہے، یہ تو عالمِ ظاہر کی مثال ہے اور عالمِ باطن کی فنا کا نتیجہ انتہائی عظیم ہے، جہاں ہر چیز قبضۂ قدرت میں جا کر عقل و علم کی روشنی بن جاتی ہے، جس طرح اوپر اس کا ذکر ہو چکا، اور اس کے ساتھ ساتھ آپ سورۂ رحمان (۵۵/۲۶-۲۷)

میں بھی دیکھیں، جیسا کہ فرمایا گیا ہے :-

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۔ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ

(۵۵/۲۶-۲۷) تاویلی مفہوم : عالمِ شخصی میں جو مخلوقات و موجودات ہیں، وہ سب مقامِ عقل پر فنا ہو کر نورِ عقل سے واصل ہو جاتی ہیں، اور چہرۂ خدا جو صاحبِ جلالت و کرامت ہے وہ باقی رہتا ہے، جس کے ہاتھ میں یہ نور ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہمیشہ سے وقوع میں آتا رہا ہے، آپ اُس کے اِس پاک فرمان میں غور کیجئے، جو سورۂ مومن کے آخر میں ہے۔

سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ فِي عِبَادِهِ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكَافِرُونَ (۴۰/۸۵) تاویلی مفہوم : خدا کی عادت (قانون) ہمیشہ سے اس کے خاص بندوں (انبیاء و اولیا) کی رُوحانیت میں گزرتی رہی ہے، اور کافر لوگ بس اسی مقام پر گھاٹے میں رہے، کیونکہ اُنہوں نے اِنسانِ کامل کو نہیں پہچانا، جس کی ذات میں قانونِ خدا پوشیدہ ہوا کرتا ہے۔

اِس قانون کے مطابق اگر مانا جائے کہ ہر چیز پہلے ہی سے نورِ عقل میں فنا ہو چکی ہے، تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ پتھر کا عقلی وجود بھی اُس عالم یعنی اُس نور میں موجود ہے، اور ہاں یہ حقیقت ہے، لہٰذا آپ سورۂ بقرہ کی آیت ۷۴ میں خوب غور کریں کہ اس میں کس طرح ایک عقلی پتھر سے علم و حکمت کی نہریں جاری ہو جانے کا ذکر فرمایا

گیا ہے، صرف یہی نہیں بلکہ قرآنِ حکیم میں جہاں جہاں کسی پتھر یا پہاڑ کا ذکر آیا ہے، وہاں حکمت کے حسن و جمال کے ساتھ عقلی جواہر پیش کئے گئے ہیں، اِن چند مثالوں کو دیکھئے :-

۱۔ انبیاء و ائمہ علیہم السّلام کے شخصی عوالم (دُنیائیں) ایک ہی قانونِ رُوحانیت کے تحت ہُوا کرتے ہیں، اگر ہم اِس حقیقت کو تسلیم کر لیتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے اپنی تجلّی ڈال کر حضرت موسیٰؑ کے عقلی پہاڑ کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا، تو پھر لازمی طور پر اِس بات کو بھی قبول کرنا ہوگا کہ خُدائی عادت (سُنّت) کا یہی معجزہ ہر کامل اِنسان پر گزرتا ہے، تاکہ ان بیشمار ٹکڑوں سے علم و حکمت کی ایک دُنیا تعمیر کی جائے (۱۴۳/۷)۔

۲۔ مثال کے طور پر عقل کے کوہِ طور کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ہیں، لہٰذا قرآنِ پاک میں جہاں جہاں پہاڑ کا نام آتا ہے، اِس سے یہی ٹکڑے مُراد ہُوا کرتے ہیں، چُنانچہ شہد کی مکھی سے فرمایا گیا ہے کہ وہ پہاڑوں میں اپنے چھتّے بنائے (۱۶/۶۸) اِس کے یہ معنی ہیں کہ عقل کے ان پہاڑوں (ٹکڑوں) سے تاویل کا شہد حاصل ہو جاتا ہے۔

۳۔ ارشاد ہُوا ہے : اور پہاڑوں میں قطعات ہیں جن کے رنگ مختلف ہیں کچھ تو سفید اور کچھ لال ہیں اور کچھ بالکل کالے (۳۵/۲۷) اِس میں یہ اشارہ ہے کہ عقلی پہاڑ (یعنی گوہرِ عقل) ہر قسم اور ہر

رنگ کے جواہر وغیرہ کی نمائندگی کرتا ہے۔

۴۔ فرمایا گیا ہے: اور خُدا ہی نے تمہارے آرام کے لئے اپنی پیدا کی ہُوئی چیزوں کے سائے بنائے اور اسی نے تمہارے (چھُپ کے بیٹھنے کے) واسطے پہاڑوں میں گھروندے (غار وغیرہ) بنائے (۱۶/۸۱) اس سے ظاہر ہے کہ کوہِ عقل میں ہر آدمی کا ایک پوشیدہ مکان ہے۔

۵۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اور اگر ہم اِس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو تُم اُس کو دیکھتے کہ خُدا کے ڈر سے جُھکا اور پھٹا جاتا ہے (۵۹/۲۱) عقل کے طُور (پہاڑ) پر خُدا تعالیٰ نے جو اپنی تجلّی ڈالی تھی، وہ عِلم و حِکمت کی حیثیت میں تھی، اِسی لئے اُس پہاڑ کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے، چُنانچہ قرآن اپنی رُوحی اور عقلی کیفیّت میں اللہ تعالیٰ کی وہی تجلّی ہے، جو عالمِ شخصی کے پہاڑ کو ریزہ ریزہ کر دیتی ہے۔

۶۔ سُورۃ رعد (۱۳/۳۱) میں دیکھئے: اور اگر کوئی ایسا قرآن ہوتا جس کی برکت سے پہاڑ چل کھڑے ہوتے یا اس کی وجہ سے زمین (کی مُسافت) طے کی جاتی اور اس کی برکت سے مُردے بول اُٹھتے (۱۳/۳۱) یقیناً قُرآنِ مجید کا یہ باطنی معجزہ عالمِ مثال (عالمِ شخصی) میں پیش آتا ہے، جس میں عقلی پہاڑ بدستِ خُدا چلتا رہتا ہے۔

۷۔ خُداوندِ عالم کا حِکمت آگین قول ہے: وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَاءَ تَنْبُتُ بِالدُّهْنِ وَصِبْغٍ لِّلْآكِلِيْنَ (۲۳/۲۰) اور (ہم ہی نے زیتون کا) درخت (پیدا کیا) جو طورِ سینا (پہاڑ) میں پیدا

ہوتا ہے جس سے تیل بھی نکلتا ہے اور کھانے والوں کے لئے سالن بھی ہے۔
درختِ زیتون سے وہ شخص کامل مراد ہے جو چہرۂ خدا کا قائم مقام (جانشین) ہے، طورِ سینا کا مطلب کوہِ عقل ہے، زیتون کا تیل کلمۂ باری ہے، اور سالن کلمۂ باری کی ترجمانی و تشریح ہے، صبغ (سالن) کے اس لفظ میں روٹی کو ڈبونے اور رنگین کر دینے کے معنی موجود ہیں، جس کا اشارہ ہے: کلمۂ باری کی گہرائی میں جانا اور کوئی نتیجہ حاصل کر لینا۔

خاکپائے جماعت

نصیر الدین نصیر ہونزائی

لندن:

۸ر جولائی ۱۹۸۴ء

مَربُوط حِکمتیں

سورۃ نحل (۱۶/۶۸-۶۹) میں ارشاد فرمایا گیا ہے : واوحیٰ ربُّكَ إلی النّحلِ أن اتّخذی مِنَ الجبالِ بیوتاً وّمِنَ الشّجرِ وممّا یعرِشون - ثمّ کلی مِن کُلِّ الثمرات فاسلکی سُبُل ربّكِ ذُللاً (۱۶/۶۸-۶۹) اور (اے رسُولؐ) تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ تو پہاڑوں اور درختوں اور لوگ جو اُونچے مکان بناتے ہیں اُن میں اپنے چھتے بنا، پھر ہر طرح کے پھلوں سے چُوس پھر اپنے پروردگار کی مسخّر کردہ راہوں میں چلی جا۔ اِس فرمانِ خُداوندی میں مربُوط حِکمت اور منظّم تاویل کا اصُول بیان فرمایا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ تاویل کی کلیدیں امامِ زمان صلوات اللہ علیہ کے مُبارک ہاتھ میں ہُوا کرتی ہیں، وہی حضرت جو مظہرِ نُورِ کبریا اور جانشینِ رسُولِ خُدا صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم ہیں کسی کو تاویل کرنے کی اجازت دے سکتے ہیں، چُنانچہ ایسی صُورت میں تاویل یعنی مربُوط حِکمت کی اصل واساس رُوحانیّت اور معرفت پر قائم ہوتی ہے، اور معرفت کا

آخری سرچشمہ وہاں ہے جہاں خُداوند تعالیٰ کے تین انتہائی عظیم خزانے ایک ساتھ کام کرتے ہیں، جن کے بہت سے نام اور مثالیں ہیں، اور مذکورۂ بالا ارشاد میں ان کی تشبیہہ پہاڑ، درخت، اور اُونچی عمارت سے دی گئی ہے، اور وہ نُورِ عقل، درختِ زیتون اور کلمۂ باری ہے، شجرۂ زیتون اِنسانی صُورت میں ہے۔

شہد کی مکھیوں کو لوگ پالتے بھی ہیں جس میں ان کے رکھنے کا طریقہ البتہ الگ ہوتا ہے، جس کے ساتھ نظامِ تاویل کا کوئی تعلق نہیں جبکہ یہ نظام قانونِ فطرت کے مطابق ہے، چنانچہ شہد دو قسم کا ہوتا ہے: ظاہری اور باطنی، کیونکہ خُدا کی بنائی ہُوئی نعمتیں نہ صرف ظاہر میں ہیں، بلکہ باطن میں ان سے کہیں بہتر نعمتیں موجُود ہیں (۳۱/۲۰) یہی سبب ہے کہ خُداوندِ عالم نے عقلی اور رُوحانی شہد یعنی تاویل کی مثال ظاہری شہد سے دی ہے، اور اس انتہائی شیریں، پُرقوّت، شفا بخش، جانفزا اور عقل پرور شہد کے سرچشموں کی طرف توجّہ دلائی، اور اِس شہد کی مکھیوں سے بہ اِشارۂ حکمت فرمایا کہ دیکھو تُم سب سے پہلے کوہِ عقل، پاک درخت اور بلند ترین عمارت پر اپنے چھتّے بناؤ، اور اس کے بعد میرے سدا بہار باغوں میں چلی جاؤ، جو قرآنِ حکیم اور آفاق و انفس میں موجُود ہیں، تمہارے لئے شہد بنانے سے متعلق ساری راہیں مسخّر کی گئی ہیں۔

مثال ۱: قرآنِ حکیم بار بار کائنات و موجُودات کی ہر چیز

میں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے، اور اِس سلسلے میں بعض چیزوں کی طرف تو بڑی خصوصیت کے ساتھ توجہ دلائی گئی ہے، جیسی شہد کی مکھیوں کی مثال ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے باطن (یعنی پیٹ) کو اپنی قدرتِ کاملہ سے اِنتہائی عجیب و غریب قسم کا بنایا ہے، جو دُوسرے تمام جانوروں کے پیٹ کے برعکس کام کرتا ہے، کہ اس میں جو چیز جاتی ہے وہ شہدِ شیریں بن جاتی ہے، جبکہ کسی اور جانور کے باطن میں ایسی چیزوں سے غلاظت بن جاتی ہے، ان دونوں باتوں کے درمیان جو بہت بڑا فرق ہے، اس میں قدرت کا ایک عظیم راز پنہاں ہے۔

مثال ۲ : اِس بات میں بھی بہت بڑی حکمت پوشیدہ ہے کہ شہد کی مکھیوں کی ایک بادشاہ ہُوا کرتی ہے، جو کسی وقت بھی خود کام نہیں کرتی، بلکہ دُوسروں سے کام لیتی رہتی ہے، جس کی اصل وجہ یہ ہے کہ قدرت نے اِس میں کچھ مزید خوبیاں بنائی ہیں تاکہ دُوسری سب شہد کی مکھیاں اس کی طرف کھنچے ہُوئے تابعداری کریں، اور اِسی طرح ان کی مرکزیت کی ایک مثال قائم رہے۔

مثال ۳ : اگر جانوروں کی دُنیا میں دیکھا جائے تو اِتّفاق، اتحاد، اور مونو ریالزم کی بہترین مثال شہد کی مکھیوں سے مل سکتی ہے، کیونکہ شہد بنانا ایک یا چند مکھیوں کا کام ہرگز نہیں، یہ کام ایسا مشکل ہے کہ اسے صرف ان کی ایک بہت بڑی تعداد ہی بحسن و خوبی

انجام دے سکتی ہے، اس کا اشارہ یقیناً یہی ہے کہ تاویلی حکمت کو ٹھوس شکل میں تیار کرکے لوگوں تک پہنچا دینا سخت مشکل بلکہ ناممکن کام ہے، پس شہد کی مکھیوں کی طرح نہ صرف ظاہر میں بلکہ باطن میں بھی ایک زبردست علمی لشکر کی ضرورت ہوتی ہے۔

مثال ۴: ہر دانشمند کو عظیم فرشتوں کی مرکزیت اور وحدت کے بارے میں خوب سوچنا چاہیئے کہ جبرائیل، میکائیل، اسرافیل، اور عزرائیل علیہم السّلام کیلئے ایک طرح سے الگ الگ امور مقرر ہونے کے باوجود، اور پھر ہر ایک کے ساتھ اپنا ایک زبردست لشکر موجود ہونے کے باوصف کیوں ایسا ہے کہ وہ سب مل کر کام کرتے ہیں؟ اس کی وجہ یہ نہیں، جو کہا کہ ایک فرشتہ اپنا متعلقہ کام نہیں کر سکتا، اس لئے دوسروں کی مدد ضروری ہوتی ہے، بلکہ اس کا اصل سبب رازِ وحدانیت ہے لہٰذا فرشتے قانونِ وحدت کے مطابق مل کر کام کرتے رہتے ہیں۔

مثال ۵: قرآنِ مقدّس میں یہ ارشاد ہے کہ پروردگارِ عالم کے عرش کو فرشتے اُٹھائے ہوئے ہیں مگر ہم سب انسانوں کی علمی اور عرفانی آزمائش اور رہنمائی سے رجوع کی غرض سے وضاحت نہیں کی گئی ہے کہ یہ حقیقت کس طرح ہے، کیونکہ یہ بات قطعاً ناممکن ہے کہ تختِ خداوندی (یعنی عرش) کسی مادّی چیز کے مشابہ ہو، اور فرشتے اسے ایک بھاری چیز کے معنی میں اُٹھاتے ہوں، پس جاننا چاہیئے کہ نورِ مطلق عرشِ رحمان ہے اور حضراتِ ائمہ صلوات اللہ علیہم یکے بعد دیگرے حاملانِ عرش

ہیں، اور اس تصور میں بھی مرکزیت کی مثال ہے، کہ عظیم فرشتے باری باری سے عرش کو اُٹھاتے ہیں، اور دُوسرے لاتعداد فرشتے قرب و وصال کی غرض سے اس کا طواف کر رہے ہیں۔

مثال ۶: تمام مومنین کی ارواح شہد کی مکھیوں کی طرح کام کرتی ہیں، اور امام زمانؑ کی مثال امیر النحل کی سی ہے، رُوحوں کا کام اس وقت دکھائی دیتا ہے، جبکہ انسان میں چشم بصیرت پیدا ہو جاتی ہے، جسم کے آنے جانے میں دیر لگتی ہے، مگر رُوح کے حاضر ہو جانے میں کوئی وقت نہیں لگتا، اور نہ ہمیشہ رُوح کی سواری کے واسطے ذرّۂ لطیف کی ضرورت ہے، کیونکہ وہ اس کے بغیر بھی آسکتی ہے۔

مثال ۷: آپ رُوحِ قدسی یا ایسی کسی عظیم رُوح کی تمثیل شہد کی مکھیوں سے دے سکتے ہیں، کہ وہ واحد بھی ہے، کثرت بھی ہے اور وحدت بھی، واحد کا مطلب سردار ہے، کثرت سے لشکر مُراد ہے، اور وحدت کے یہ معنی ہیں کہ ان تمام افراد کی ذات ایک ہے، جس طرح اعداد کی مثال میں شروع سے لے کر ہزار تک اور اس سے اُوپر بھی تمام عددوں کی ذات ایک ہی ہے، اور وہ عددِ واحد کی وحدت ہے، جو ہر عدد میں پنہان ہے۔

مثال ۸: شہد کی مکھیاں مونو ریالزم (MONOREALISM) کا نمونہ اِس لئے بھی ہیں، کہ وہ ہزاروں پھلوں اور پھُولوں کے رنگ و بُو اور ذائقہ کے بہت سے اِختلافات اور ہر قسم کی کثرت کو مٹا کر ان کو ایک

ہی رنگ و بُو اور ایک ہی لذّت کے رشتۂ وحدت سے منسلک کر دیتی ہیں۔

مثال ۹ : خُداوند تعالیٰ نے شہد کی مکھیوں کے بطن میں ایسا معجزہ رکھا ہے کہ جس کی بدولت وہ تلخ و شیریں ہر قسم کے پھلوں اور پھُولوں سے شہد تیار کر سکتی ہیں، اِس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اُن باغوں میں بھی، جو تاویل کے شہد سے متعلق ہیں، کڑوے پھل پھُول ہیں، لیکن اُن کے رس سے ایک جیسا تاویلی شہد بن جاتا ہے۔

مثال ۱۰ : پہاڑ کی کئی تاویلیں ہیں، چُنانچہ اس کا ایک ممثول، نُورِ عقل ہے، دُوسرا حُجّت ہے، تیسرا ممثول رُوحِ منجمد، اور چوتھا ممثول اِنسان کا سر ہے، جیسے حضرت داؤد علیہ السّلام کے بارے میں ارشاد ہُوا ہے : ولقد اٰتینا داؤدَ مِنّا فضلاً ط یٰجبالُ اَوِّبِیْ مَعَہٗ وَالطَّیْرَ (۳۴-۱۰) اور ہم نے یقیناً داؤدؑ کو اپنی بارگاہ سے فضیلت عنایت کی تھی (اور پہاڑوں کو حُکم دیا کہ) اے پہاڑو تسبیح کرنے میں ان کا ساتھ دو اور پرندوں کو بھی (یہ حُکم دیا)۔ یعنی حضرت داؤدؑ جب ذکرِ خفی و جلی کیا کرتے تھے تو اس میں آپؑ کے سرِ مُبارک کے تمام اُستخوان اور ذرّاتِ رُوح ہم آہنگ ہو جاتے تھے۔

مثال ۱۱ : رُوحِ منجمد کے باب میں ایک فرمانِ خُداوندی یہ ہے: وَتَرَی الجِبَالَ تَحْسَبُھَا جَامِدَۃً وَّھِیَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ (۲۷-۸۸) اور تم پہاڑوں کو دیکھ کر انہیں جمے ہُوئے سمجھتے ہو حالانکہ یہ (قیامت کے دن) بادل کی طرح اُڑے اُڑے پھریں گے۔ یہ ارواحِ منجمد

کی اُس کیفیت کا ذکر ہے، جو انفرادی قیامت میں اُن پر گزرتی ہے، کہ رُوحیں بادلوں کی طرح بکھری ہوئیں اُڑتی ہیں، مگر کوہِ عقل کی سیر اس سے الگ ہے۔

مثال ۱۲ : حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے بحکمِ خُدا (۲/۲۶۰) چار پرندوں کو ذبح کیا، اور ان کو کاٹ کر باہم خُوب کوٹا پیسا، پھر اس گوشت کے بارہ حِصّے دُنیا کے بارہ پہاڑوں پر رکھ دیئے، اِس کے بعد اُن چار پرندوں کو بُلایا گیا، اور وہ زندہ ہوکر حضرت ابراہیمؑ کے پاس حاضر ہوگئے، یہ دراصل حضرت ابراہیم کے چار مقرّب حُجّت تھے، جن کو اسمِ اعظم کی اوکھلی میں کوٹا گیا تھا، پھر ان کو بارہ جزائر کے حُجّتوں کے پاس بھیجا گیا تھا، چُنانچہ جب وہ واپس آئے تو اپنے ساتھ بارہ حُجّت بھی ساتھ لائے، بارہ حُجّتوں کے ساتھ ۳۶۰ داعی تھے، اور داعیوں کے ساتھ دُنیا بھر کے لوگ، پس معلوم ہُوا کہ یہاں پہاڑوں کی تاویل حُجّتان ہیں۔

مثال ۱۳ : رُوحانیّت اور علمِ تاویل پانی کی طرح ہے، اور قُرآنی قصّے یا مثالیں مختلف شکل کے ظروف (برتن) کی طرح ہیں، چُنانچہ قِصّۂ آدمؑ کے برتن کو ایسا بنایا گیا ہے جیسا کہ قانونِ حکمت کے بموجب بنانا چاہیئے، اِسی طرح ہر پیغمبر کو مثال کا ایک مختلف اور جُداگانہ ظرف ملا ہے، اِس کے یہ معنی ہوئے کہ تمام انبیاء علیہم السّلام کی رُوحانیّت صراطِ مُستقیم کی مُتعیّن صورت ہے، اِس لئے وہ ایک ہی

ہے، اور اِس میں کوئی فرق نہیں۔

مثال ۱۴ : سُورۂ حج (۲۲/۲۶-۳۰) کے تاویلی اشارات کے مطابق حضرت ابراہیمؑ اپنے وقت میں بیت اللہ کا ممثول تھے، وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ (اور لوگوں کو حج کیلئے پکارو) اگر نگاہِ حقیقت سے دیکھا جائے تو یہ قصّہ وہی ہے جس میں حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے چار پرندوں کے ذریعہ دُنیا بھر کے لوگوں کو اپنے پاس بُلا لیا تھا، جس کا اُوپر ذکر ہو چکا ہے، ورنہ اُس زمانے میں مادّی طور پر کونسی سہُولت تھی کہ جس سے دُنیا کے سب لوگوں کو پکارا جاتا، جبکہ ناس سے سب لوگ مُراد ہیں، یہاں تک کہ اِس لفظ میں اوّلین و آخرین بھی ہیں، کیونکہ یہ حضرت ابراہیمؑ کی انفرادی قیامت کا تذکرہ ہے۔

مثال ۱۵ : جبب طُور، جبل، جِبال، رواسی اور اعلام جیسے الفاظ میں پہاڑ سے نُورِ عقل مُراد ہے تو پہاڑ سے نکلنے والی بہت سی چیزوں کی بھی یہی تاویل ہے، جیسے جواہر، معدنیات، پتھر، چشمے وغیرہ، مٹی کی تاویل مومن ہے، آدم کی خلقت مٹی سے ہُوئی، یعنی آدمؑ کی رُوحانی تخلیق درجۂ مومنی سے شروع ہُوئی، یا یُوں کہیں کہ آدمؑ شروع شروع میں صرف ایک مومن کا درجہ رکھتے تھے، پھر اُن کو رفتہ رفتہ بلند مرتبہ دیا گیا۔

مثال ۱۶ : اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا : اِنِّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (۲/۳۰) یقیناً میں (اپنا) ایک نائب

زمین میں بنانے والا ہوں۔ آپ اِس آیۃ کریمہ کو بھی غور سے دیکھیں : اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَمَنْ عَلَیْھَا وَ اِلَیْنَا یُرْجَعُوْنَ (۱۹/۴۰) اِس میں شک نہیں کہ (ایک دن) زمین اور جو کچھ اس پر ہے (اس کے) ہم ہی وارث ہونگے اور سب کے سب ہماری طرف لوٹائے جائیں گے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ پہلی آیت میں فی الارض ہے مگر علی الارض نہیں، اور دُوسری آیت میں علیہا ہے لیکن فیہا نہیں، اِس میں کیا راز ہے؟ اس کا تاویلی راز یہ ہے کہ پہلی آیت زمینِ دین سے متعلّق ہے، اور مومنین دین کی زمین ہیں، کیونکہ جب مٹی کی تاویل مومن ہے تو پھر اہلِ ایمان ہی تاویلی زمین ہیں چُنانچہ خلیفۂ خُدا مومنین کے درمیان بھی ہے اور ان کے باطن میں بھی ہے، لہٰذا "فی الارضِ خلیفہ" کے معنی بدرجۂ انتہا دُرست ہیں، مگر دُوسری آیت زمینِ دُنیا کے بارے میں ہے جس کی سطح یا پُشت پر لوگ رہتے ہیں، اور وہ اس کے اندر نہیں رہتے، لہٰذا لوگوں کی جسمانی حیثیت جس طرح سیارۂ زمین کی سطح پر ہے اس کے لئے "من علیہا" فرمانا حق و صدق سے بھرپُور ہے۔

مثال ۱۷ : اِس پر شاید کوئی عزیز یہ سوال اُٹھائے تو عجب نہیں کہ قُرآنِ کریم میں بہت سی آیات ایسی ہیں جن میں اِنسان کے اِس مادّی زمین سے تعلّق کو "فی لارض" (زمین میں) یا "فیہا" (اس میں) فرما کر ظاہر کیا گیا ہے، جیسے ارشاد ہے : مِنھا خلقنٰکم وفیھا نُعیدکم ومنھا نخرِجکم تارۃً اُخرٰی (۲۰/۵۵) ہم نے اُسی (زمین) سے

تم کو پیدا کیا اور اس میں لوٹا کر لائیں گے اور اسی سے دوسری بار تم کو نکالیں گے۔ آپ اس کی تاویلی وضاحت کر کے سمجھائیں۔ میں یوں عرض کروں گا کہ مومنین کی روحانی حیثیت خدا کی زمین ہے، اسی سے سب لوگ پیدا ہو جاتے ہیں، اور اسی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں، اور وہیں سب کو زندہ ہو جانا ہے۔

مثال ۱۸ : خشکی کی تاویل مادیت ہے اور سمندر کی تاویل روحانیت، قولہ تعالیٰ : وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَأْكُلُوا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُوا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا (۱۶/۱۴) اور وہی وہ خدا ہے جس نے سمندر کو مسخر کر دیا تاکہ تم اس میں سے تازہ تازہ گوشت کھاؤ اور زیور (کی چیزیں موتی وغیرہ) نکالو جن کو تم پہنا کرتے ہو۔ یعنی خدا تعالیٰ نے روحانیت کو تمہارے لئے امامِ زمان کے وسیلے سے مسخر کر دیا ہے، تاکہ تم اس سے روحانی علم حاصل کرو، اور اس سمندر کی گہرائی سے گوہرِ عقل کو نکالو۔

مثال ۱۹ : اس ارشاد میں قرآنِ حکیم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس قول کی ترجمانی کرتا ہے جس میں حقیقتِ واحدہ کا سب سے عظیم راز پوشیدہ ہے : رَبِّ هَبْ لِي حُكْمًا وَّ الْحِقْنِي بِالصّٰلِحِيْنَ وَاجْعَلْ لِّي لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ (۲۶/۸۳-۸۴) تاویلی مفہوم: پروردگار مجھے کلمۂ کُن کا ایک خزانہ عطا فرما اور صالحین سے ملا دے، یعنی مجھے سلسلۂ نور میں ہمیشہ کے لئے زندہ رکھ اور کامل انسانوں کی زبانِ

صدق کو میری زبان بنا دے، یعنی حضرت خاتم الانبیاؐ تک پیغمبروں کی زبان، اور آپؐ کے بعد اماموں کی زبان۔

مثال ۲۰ : سُورۂ مریم (۱۹/۵۰) میں ہے : وَجعلنا لھم لِسانَ صِدقٍ عَلِیّاً (۱۹/۵۰) اور ہم نے ان کے لئے (ہمیشہ دُنیا میں) بدرجۂ اعلیٰ زبانِ صدق بنایا۔ یعنی ان کو ہمیشہ نُورِ حق میں زندہ رکھا، تاکہ وہ اپنے جانشینوں کو اعلیٰ درجے کے حقائق بیان کریں، جیسے پیغمبرِ اکرمؐ بحکمِ خُدا عادل اُمّت یعنی اَئمّہ (۲/۱۴۳) پر گواہ ہیں، اور گواہ جس کو عربی میں شاہد یا شہید کہا جاتا ہے غائب ہونے کی صُورت میں نہیں، بلکہ حاضر رہنے کے معنی میں دُرست ہے، اِس سے ظاہر ہے کہ آنحضرتؐ اماموں پر گواہ ہیں، اور اَئمّہؑ لوگوں پر گواہ ہیں، یعنی ہر امامؑ اپنے زمانے کے لوگوں کا گواہ ہے، اور اسی سبب سے قیامت کے دن خُدا تعالیٰ اہلِ زمانہ کو ان کے امام کے ساتھ بُلاتا ہے (۱۷/۷۱)۔

مثال ۲۱ : امامِ زمان صلوات اللہ علیہ ہر مومن کو نُور کی چنگاری دے سکتے ہیں اور دیتے بھی ہیں، اور ہمیشہ سے اللہ تعالیٰ کی یہی سُنّت و عادت چلی آتی ہے، بہرحال یہ چنگاری کسی ذیلی اور ضمنی روشنی سے نہیں بلکہ سرچشمۂ نُورِ عقل سے ہُوا کرتی ہے، جیسا کہ کتابِ عزیز کا ارشاد ہے : قال لاھلہِ امکثوا اِنّی انستُ ناراً لعلّی اٰتیکم منھا بخبرٍ اَوجذوۃٍ من النّار لعلّکم تصطلون (۲۸/۲۹ مُوسیٰؑ نے) اپنے لوگوں سے کہا کہ تم لوگ (یہاں) ٹھہرو میں نے یقیناً آگ دیکھی ہے

شاید میں اِس سے تم کو کوئی خبر یا کوئی چنگاری لاؤں تاکہ تم لوگ آگ تاپو۔ اس کا خلاصہ یہ ہُوا کہ جب ہادیٔ برحق مرتبۂ نورُ پر فائز ہو جاتا ہے تو اِس سے اہلِ ایمان کو دو بہت بڑے بُنیادی فائدے حاصل ہو سکتے ہیں، ایک خبر ہے اور دُوسرا جذوہ (چنگاری) خبر سے علم و ہدایت مُراد ہے، اور جذوہ سے اسمِ اعظم مقصُود ہے، اور آگ تاپنے کی تاویل ہے اسمِ بُزرگ سے فائدہ اُٹھانا۔

مثال ۲۲ : سورۂ مائدہ (۵/۵۴) میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ایسی قوم کو (عالمِ شخصی میں) پیدا کرے گا جنہیں خُدا دوست رکھے گا، اور وہ خُدا کو دوست رکھیں گے، وہ مومنین کے حق میں منکسر اور کافروں پر بہت سخت ہوں گے وہ راہِ خُدا میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی کچھ پرواہ نہیں کریں گے (۵/۵۴) یہ خُدا و رسُولؐ اور امامؑ کے رُوحانی لشکر کا تذکرہ ہے، جن کی بدولت عوالمِ شخصی کو فتوحات حاصل ہوتی رہتی ہیں۔

مثال ۲۳ : ایک اعتبار سے اُس نُورِ ہدایت کا سفر جو عالمِ دین میں ہے ماضی سے مُستقبل کی طرف ہے، جبکہ زمانۂ ظاہر کا سفر اس کے برعکس مُستقبل سے ماضی کی طرف ہے، اِس کا مطلب یہ ہُوا کہ نُورِ ماضی کے جُملہ واقعات و حالات ریکارڈ کرتے ہُوئے آتا ہے، جیسے خزائنِ خُدا کا تصوّر ہے کہ ان میں تمام چیزیں موجُود ہوتی ہیں، اور کوئی شئے ایسی نہیں جو وہاں نہ ہو (۱۵/۲۱)۔

مثال ۲۴ : عالمِ رُوحانیت اور دُنیائے قرآن کے بہت سے درختوں پر تاویلی شہد کی مکھیوں کے چھتے موجود ہیں، جیسے شجرۂ طیبہ (۱۴/۲۴) پر، درختِ طورِ سینا (۲۳/۲۰) پر، شجرۂ مُبارکہ زیتون (۲۴/۳۵) پر، بُقعۂ مُبارکہ کے درخت (۲۸/۳۰) پر اور اُس درخت (۴۸/۱۸) پر، جس کے نیچے زمانۂ نبوّت کے مومنین نے حضورِ انورؐ کے دستِ مُبارک پر بیعت کی تھی، اور بھی ایسے درخت ہیں، مگر وہ سب ایک ہی درخت ہے۔

مثال ۲۵ : خُداوندِ عالم نے فرعون کی بیوی آسیہ کے اِس واقعے کو قرآنِ حکیم میں مثال کا درجہ دے کر بیان فرمایا ہے کہ اُس نے یہ دُعا کی : اِذ قالت ربِّ ابنِ لی عِندَکَ بیتاً فی الجنّۃِ... (۶۶/۱۱) جب اُس نے دُعا کی پروردگار! میرے لئے اپنے پڑوس ہی میں بہشت میں ایک گھر بنا... یہ تصوّر بڑا فکر انگیز ہے کہ جنّت میں بعض لوگ یا سب خُدا تعالیٰ کے پڑوسی ہوں گے اور ربِّ عزّت اُن کا پڑوسی ہوگا، اور یہ بات کسی بھی صُورت میں حقیقت ہے، ورنہ آسیہ کا یہ قول قانونِ قرآن کے اجزاء میں داخل نہ ہو سکتا، تاہم کوئی ہوشمند اِس کو قبول کرتے ہُوئے بھی یہ سوال کر سکتا ہے کہ اللہ سب کا ہمسایہ ہو، یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ اُس کا جواب یُوں ہے کہ یہ جسمانی تصوّر نہیں، بلکہ عقلی بات ہے، اور عقل کی شخصی بہشت میں ہر بڑی سے بڑی نعمت حاصل ہو سکتی ہے، اور یہ تصوّر بیحد مفید ہے کہ ہر

اِنسان جس طرح یہاں اپنے باطن میں ایک ذاتی عالم رکھتا ہے، اِسی طرح بہشت میں بھی ہوگا۔

مثال ۲۶ : قرآن مجید میں لفظِ لُؤلُؤ کو خاص اہمیّت دی گئی ہے، یہ مثال درمثال کے طور پر استعمال ہُوا ہے، یہ اسم چھ مرتبہ مذکور ہے، ایک بار لفظ دُرّ + ی (۲۴/۳۵) بھی ہے، اور حِلْیَۃً (زیورات) کے نو صیغے ہیں، لُؤلُؤ اور دُرّ دونوں موتی کے نام ہیں، موتی کا مطلب گوہر بھی ہے اور جوہر بھی، اگرچہ موتی سمندر کی گہرائیوں میں پیدا ہوتے ہیں، اور مختلف قسم کے جواہر پہاڑوں کے سینوں میں، تاہم کئی معنوں میں یہ سب ایک ہی شئے اور ایک جوہر (ذات) کی مختلف شکلیں ہیں۔

ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ خُدا تعالیٰ نے دینِ حق کو دُنیائے ظاہر کی مثال پر بنایا ہے، اِس کے یہ معنی ہوئے کہ اللہ کے خزانے ہیں، اور اُن میں اپنی نوعیّت کے اِنتہائی گرانقدر خُدائی جواہر پوشیدہ ہیں، وہ گوہر نُورِ عقل اور علم و حکمت کے ہیں، اور رُوح و رُوحانیّت کے ہیں۔

مثال ۲۷ : موتی صدف (سیپ) میں پوشیدہ ہوتا ہے، اور صدف سمندر کی تھاہ میں پنہاں رہتی ہے، اور جب اس کو وہاں سے نکالا جاتا ہے، تو پھر بھی اسے کسی طرح چُھپا کے رکھنا پڑتا ہے، جیسے جوہری کی حفاظت میں، یا کسی شاہی خزانے میں، یا کسی امیر کے

گھرانے میں محفوظ ہوتا ہے، اِسی طرح خُداوند تعالیٰ کے بھیدوں کے موتی اس کے خزائن میں پوشیدہ ہُوا کرتے ہیں، اور اسی معنیٰ میں جواہرِ عقل کو لُؤلُوئے مکنون (پوشیدہ موتی) کہا گیا ہے، اور یہ اہم نکتہ فراموش نہ ہو کہ لُؤلُوئے مکنون کتابِ مکنون کے ساتھ مربُوط ہے۔

مثال ۲۸ : خُدائے علیم و حکیم نے قُرآنِ پاک میں جہاں انتہائی اعلیٰ حقائق کی مثال دُنیا کے انمول جواہر سے دی ہے، وہاں ان گرانمایہ گوہروں کے ظاہری حسن و جمال کے ساتھ ساتھ باطنی عجائب و غرائب بھی پیشِ نظر ہیں، مثلاً قیمتی پتھّروں سے لاتعداد برس پہلے پہاڑوں کا وجُود میں آنا، پہاڑ کے خاص خاص حِصّے میں جواہر کا پیدا ہو جانا، اور معدنی رُوح کا تصوّر، وغیرہ۔

مثال ۲۹ : ہر چیز کی رُوح ہوتی ہے، اِسی طرح تمام جواہر کی بھی رُوح ہے، مثلاً ایک قسم کے سفید پتھّر میں سُرخ یاقُوت بنتا ہے، ظاہر ہے کہ پہاڑ کے باطن تک کوئی مادّی قسم کا بیج نہیں جا سکتا، مگر ہاں رُوح جا سکتی ہے، اور صرف رُوحِ معدنی ہی رفتہ رفتہ سنگِ سفید کو یاقُوتِ احمر میں تبدیل کر دیتی ہے، اور یہ بحقیقت رُوح کا بہت بڑا معجزہ ہے کہ پتھّر کو گوہر بنا دیتی ہے، اِسی طرح مرجان (۵۵/۵۸ مونگا) میں فطرت کا ایک معجزہ یہ ہے کہ وہ رُوحِ حیوانی سے نبات بن جانے کا نمونہ ہے، جبکہ موتی رُوحِ حیوانی سے جماد پیدا ہو جانے کی مثال ہے۔

مثال ۳۰ : نُورِ عقل بیشک عالمِ ممثول ہے، لہٰذا دُنیا کی تمام چیزیں

اپنی اپنی تمثیلات میں اسی کی طرف اشارہ کرتی رہتی ہیں، خصوصاً جواہر جو اس مادّی عالم کی اشیاء میں بیش بہا اور اعلیٰ ہیں، وہ اپنی ظاہری مادّی، محدود، اور فنا پذیر خوبیوں سے اُس نُور کے باطنی، رُوحانی، عقلی غیر محدود، اور لازوال اوصاف و کمالات کی دلالت کرتی ہیں، تاکہ اہلِ جہان نُور کے خزانوں اور جواہر کو پہچان سکیں، پھر ان کے حصُول کیلئے صحیح معنوں میں سعیٔ پیہم کریں۔

خاکِ راہِ جماعت

نصیر الدین نصیر ہونزائی

لندن :

۱۳ر جولائی ۱۹۸۴ء

سلامتی کی حکمتیں

۱۔ سلامتی کے عام معنی ہیں خیریت، عافیت، حفاظت، بچاؤ، محفوظ ہونا، صحت، تندرستی، زندگی، حیات، موجودگی، وغیرہ، اور اور اس کے خاص معنی ہیں رُوحانی تائید و مکالمہ، سپردگی، خُدا کی حفاظت میں ہونا، حیاتِ جاودانی، اور یک حقیقت کے راز کو جاننا۔

۲۔ قرآنِ حکیم میں سلامتی کا اصل لفظ "سلام" ہے، جس کا مادّہ س ل م (سلم) ہے، اِس لئے قرآنِ پاک کے ایسے بہت سے الفاظ جو اس مادّہ سے بنے ہیں سلامتی کے موضوع سے متعلق ہیں، اور ان سے اس سلسلے کے بہت سے مفاہیم مل سکتے ہیں، اِنشاء اللہ تعالیٰ، ہم یہاں اِس مطلب کی چند مثالیں پیش کریں گے، جیسے سُورۃ بقرہ (۲/۷۱) میں لفظ مُسَلَّمَۃٌ کے معنی سالم کے ہیں، اور سورۃ نساء (۴/۹۲) میں اِس کا ترجمہ "سپرد کی گئی" ہوتا ہے، اِس سے یقیناً یہ معلوم ہُوا کہ سلام اور سلامتی کے معنوں میں سالمیت اور سپردگی دونوں شامل ہیں۔

۳۔ لفظ اِسلام کے اصل معنی ہیں حوالہ (سپرد) کر دینا، چنانچہ

دینِ اسلام کا مطلب یہی ہے کہ کوئی اپنے آپ کو خُدا کے حوالہ کر دے، جیساکہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے بارے میں ارشاد ہُوا ہے: اذ قال لہٗ ربُّہٗ اسلم قال اسلمتُ لربِّ العٰلمین (۲/۱۳۱) جب ان سے ان کے پروردگار نے کہا (خُود کو) سُپرد کر دے، تو عرض کی مَیں نے (خُود کو) سارے جہان کے پروردگار کے سُپرد کر دیا۔ اور اس میں علم و عمل کا ذکر ہے، جیساکہ فرمایا گیا ہے: وَمَن یُّسلِم وجھہٗ الی اللہ وھو محسنٌ فقد استمسک بالعُروۃِ الوُثقیٰ (۳۱/۲۲) اور جو شخص چہرۂ باطن خُدا کے سُپرد کرے اور وہ نیکوکار بھی ہو تو بیشک اُس نے مضبُوط حلقہ پکڑ لیا۔ اِس حُکم میں نظریۂ اِسلام قبُول کرنے اور اس کے مُطابق عمل کرنے کا بیان ہے۔

۴۔ جب رسُولِ خُدا صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے تصوّرِ اسلام کو عملی جامہ پہنایا، اور اپنے چہرۂ باطن کو علم و معرفت کی روشنی میں چہرۂ خُدا کا قائم مقام بنایا، تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حُکم ہُوا کہ آپؐ اپنے نمونۂ عمل کو بطریقِ حکمت بیان کریں، خُداوندِ عالم کا وہ فرمان یہ ہے: فاِن حآجُّوک فقُل اسلمتُ وجھِیَ للّٰہِ ومن اتبعنِ (۳/۲۰) اے رسُولؐ! پھر اگر یہ لوگ تم سے حُجّت کریں تو کہہ دو کہ مَیں نے اپنا چہرۂ باطن خُدا کے سُپرد کر دیا اور جو میرے تابع ہیں (یعنی ائمّۂ ہُدیٰ نے بھی) اور اگر رحمتِ عالمؐ کے اُسوۂ حسنہ میں یہ اشارہ نہ ہوتا، تو اُس مقام پر کسی مُسلم کو ابدی زندگی کی کوئی اُمید ہی نہ ہوتی، جہاں چہرۂ خُدا کے سوا ہر چیز اور ہر شخص

ہلاک و فنا ہو جاتا ہے (۲۸/۸۸ ، ۵۵/۷۷) کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا زبردست قانون ہے کہ اس کے چہرۂ پاک کی بہشت سے باہر کوئی چیز زندہ اور سلامت نہیں رہ سکتی ہے، اِس سے یہ اعلیٰ حقیقت روشن ہو کر سامنے آگئی کہ ہر مومن کی سلامتی اِس بات میں ہے کہ وہ چہرۂ خُدا کو پہچانے اور اُس میں فنا ہو جائے۔

۵۔ اِس ارشادِ مُبارک میں سلامتی کی اساسی حکمتیں پوشیدہ ہیں: قد جآءکم من اللہ نورٌ وّ کتٰبٌ مّبین۔ یھدی بہ اللہ من اتبع رضوانہ سُبُل السّلٰم ویخرجھم من الظّلمٰت الی النّور باذنہ ویھدیھم الیٰ صراطٍ مُستقیم (۵/۱۵-۱۶) تمہارے پاس تو خُدا کی طرف سے ایک نُور اور کتابِ مُبین آچکی ہے، جو لوگ خُدا کی خوشنودی کے پابند ہیں ان کی تو اِس کے ذریعہ سے سلامتی (تائید) کی راہوں کی ہدایت کرتا ہے اور اپنے اذن سے تاریکی سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے اور انہیں راہِ راست پر چلاتا ہے۔ اِس فرمانِ خُداوندی کے مطابق نُور سے آنحضرتؐ مُراد ہیں، کیونکہ اِسلام کی ہر چیز کی ترتیب میں آپ سب سے پہلے تشریف لاتے ہیں، پھر قرآنِ پاک کا ذکر ہے، ظاہر ہے کہ ان دونوں کا مقصد سلامتی یعنی تائید کی راہیں دکھانا ہے، اور ان راہوں سے حضراتِ ائمہؑ مُراد ہیں کہ ہر امام اپنے وقت میں تائیداتِ رُوحانی کی سبیل ہے، اذن کی تاویل حجّت، پیر وغیرہ ہیں، جو آج کے دورِ قیامت ہونے کی وجہ سے جسمِ ظاہر میں نہیں ہیں، اور اذن کی دُوسری تاویل اسمِ اعظم ہے، کہ وہ امامِ زمانؑ کے وسیلے سے خُدا تعالیٰ کا اذن ہے، اور اس فرمانِ

خُداوندی کے مُطابق صراطِ مُستقیم سے حضرت قائم علیہ السّلام مُراد ہے، آپ دیکھتے ہیں کہ ربّانی ہدایت کے تمامتر وسائل اِسی پاک ہستی کی طرف رُخ کئے ہُوتے ہیں، اور اگر تاویل سے قطع نظر عام طور سے سوچنا ہے تو یہاں یا تو سبیل کا ذکر کافی ہوتا یا صراطِ مُستقیم کا، لیکن ایسا نہیں ہے، اور اس کی وجہ تاویلی حکمت ہے، جس کا ذکر ہو چُکا۔

۶۔ اِسی سلسلے میں ارشاد فرمایا گیا ہے: واللّٰہُ یدعوآ اِلیٰ دارالسّلٰم ط ویھدی من یشاءُ اِلیٰ صراطٍ مُستقیم (۱۰/۲۵) اور خُدا سلامتی کے گھر کی طرف بُلاتا ہے اور جس کو چاہتا ہے راہِ راست پر چلاتا ہے۔ دارالسّلام کے چار معنی ہیں۔

(الف) سلامتی کا گھر یا تائید کا گھر۔

(ب) بہشت کا گھر، کیونکہ دارالسّلام ایک بہشت کا نام ہے۔

(ج) خُدا کا گھر، اِس لئے کہ السّلامُ خُدا کا نام ہے۔

(د) اور ایک اعتبار سے خُدا خود، کیونکہ وہ اَلسّلامُ ہے، جس کے معنی ہیں سلامتی، یعنی نُور جو سلامتی کا گھر ہے، جبکہ سلامتی نُور سے الگ نہیں۔

۷۔ خُدا میں فنا ہو جانے سے اس کا انتہائی قرب حاصل ہو جاتا ہے، یہی سلامتی بھی ہے اور سلامتی کا گھر بھی، جیسے قرآن میں ہے: لھم دارالسّلٰم عند ربّھم وھو ولیّھم بما کانوا یعملون (۶/۱۲۷) ان کے واسطے ان کے پروردگار کے قرب میں سلامتی کا گھر ہے

اور دُنیا میں اُنہوں نے جو عمل کیا تھا اُس کی وجہ سے خُدا ان کا دوست ہوگا۔ خُدا کی دوستی مومنین کے لئے سب سے بڑی سعادت ہے، جیسے سورۂ یُونس (۱۰/۶۲) میں ارشاد ہُوا ہے: آگاہ رہو اس میں شک نہیں کہ دوستانِ خُدا پر (قیامت میں) نہ تو کوئی خوف ہوگا، اور نہ وہ غمگین ہوں گے، یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور تقویٰ اختیار کرتے تھے، انہی لوگوں کے واسطے دنیوی زندگی میں (بھی) اور آخرت میں بھی، خوشخبری ہے، خُدا کی باتوں میں اَدل بدل نہیں ہُوا کرتا، یہی تو بڑی کامیابی ہے (۱۰/۶۴) یہاں یہ بات یاد رہے کہ خوف کا تعلق مستقبل سے ہے، اور غم کی نسبت ماضی سے، چُنانچہ اگر کوئی شخص آنے والے کسی بھی زمانے میں ختم ہو جانے کا اندیشہ رکھتا ہے یا یُوں خیال کرتا ہے کہ یہ زمانہائے دراز تک خوابِ عدم میں سو رہا تھا، جس کی وجہ سے وہ اُس دوران خُدا کی نعمتوں سے محروم رہا، تو یہ دونوں باتیں خوف و غم کو ظاہر کرتی ہیں، حالانکہ خُداوند تعالیٰ نے اپنے اولیاء یعنی دوستوں کے بارے میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس میں ان کی ازلی اور ابدی سلامتی کی ضمانت ہے، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت ایسی ہے کہ ہر شخص اپنی اُس دائمی بقاء اور سلامتی کی معرفت کو حاصل کر سکتا ہے، جو کسی ابتداء و انتہا کے بغیر خانۂ سلامتی سے وابستہ ہے۔

۸۔ خُدا کے دوستوں کے سردار امام زمان علیہ السّلام ہیں، اور یہ بات ایسی ہے جیسے مومنین اور امیر المومنین، اسی مظہرِ خُدا کے

نُور میں سلامتی کے بھید پوشیدہ ہیں، اسی پاک ہستی کے دوست خُدا کے دوست ہیں، اور اسرارِ سلامتی انہی کے لئے خاص ہیں، چُنانچہ جب خُداوندِ عالم کے پاک حضور میں دُعا کی جاتی ہے کہ اِھدنا الصِّراط المستقیم، تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ مومن راہِ راست کو کھو بیٹھا ہے، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اِس پر آگے سے آگے چل کر منزلِ مقصود میں پہنچ جانا چاہتا ہے، بالکل اِسی طرح مومنین سلامتی کے گھر میں رہتے ہوئے دُعا مانگتے ہیں کہ خُدایا ہم کو سلامتی کے گھر میں داخل کر دے، اِس میں ایسا علم و عرفان مطلوب ہے کہ اس سے اسرارِ سربستہ کھُل جائیں، اور نتیجے کے طور پر مومنین اپنے آپ کو پہلے ہی سے دار السّلام میں موجُود پائیں۔

۹۔ سورۃ یاسین (۳۶/۵۷-۵۸) میں دیکھئے: لھم فیھا فاکھۃ وّ لھم مّا یدعون۔ سلامٌ قولاً مّن رّبٍّ رّحیم (۳۶/۵۷-۵۸) بہشت میں ان کے لئے میوے ہیں اور جو وہ چاہیں ان کے لئے (حاضر) ہے، مہربان پروردگار کا ایک قول (یعنی کلمۂ باری) نُورِ تائید ہے۔ یعنی کلمۂ باری نُورِ تائید ہے، چُنانچہ جنّت میں عقل و رُوح اور لطیف جسم کے واسطے طرح طرح کے میوے مہیّا ہیں، اِس کے علاوہ وہاں ہر چیز ایسی مل سکتی ہے، جس کی اہلِ بہشت آرزُو کرتے ہوں، مثال کے طور پر وہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ بہشت میں جو رُوح کے بھیدوں کا علم ہے، اس کی روشنی میں وہ اپنے آپ کو کسی ابتداء و انتہا کے بغیر سلامتی کے گھر میں پائیں، اور دُنیا میں وہ جس طرح اپنی زندگی کو محدُود اور غلط سمجھتے تھے، وہ ایک

تکلیف دہ خواب کی طرح بے بُنیاد قرار پاتے، کہ آدمی جب ایسے خواب سے بیدار ہو جاتا ہے تو شکر کرتا ہے کہ اس تکلیف کا کوئی مُستقل وجُود نہیں سو بہشت میں ایسا ہی ہوگا کہ جنّت والے خود کو پہلے ہی سے وہاں موجُود و سلامت پائیں گے، اِس کی وجہ یہ ہوگی کہ ان کی انائے علوی کبھی دُنیا میں آئی ہی نہ تھی، مگر ہاں انائے سِفلی دُنیا میں اُتری تھی، اور اس حقیقت کی مثال سُورج ہے کہ وہ اپنی جگہ پر قائم ہے، اور اس کی شعاعیں جگہ جگہ رسائی کرتی رہتی ہیں۔

۱۰۔ ربِّ رحیم کے ایک قول (کلمۂ باری) میں سب سے بلند درجے کی تائید اور سب سے اعلیٰ سلامتی کے اسرار پوشیدہ ہیں، جیسے حدیث قُدسی میں اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا کہ: اے ابنِ آدمؑ میری اطاعت کر تاکہ میں تجھ کو اپنے مانند ایسا زندہ قرار دوں گا کہ تو کبھی نہ مرے گا، ایسا معزّز کہ تو کبھی ذلیل نہ ہوگا، اور ایسا غنی (دولت دار) کہ تُو کبھی محتاج نہ ہوگا۔ یا ابنِ آدم أطعني أجعلك مثلي حيّاً لاتموت أبداً، وعزيزاً لاتزل، وغنياً لاتفتقر (المجالس المؤيّدية صـ۵۵) کیا یہ ایک نئی تخلیق ہوگی جو پہلے نہ ہو؟ نہیں اس میں تخلیق کی بات نہیں، کیونکہ اس میں اجعلكَ ہے، اخلقكَ نہیں، یعنی قرار دینا ہے بنانا نہیں، پس اسکا مطلب یہ ہُوا کہ خُداوند تعالیٰ اپنے فرمانبردار بندوں کو ایسے ایسے بھیدوں سے آگاہ کرے گا کہ اُن کی روشنی میں وہ اپنے آپ کو پہچان لیں گے، اور وہ اپنی رُوحِ علوی کو کسی ابتدا و

انتہا کے بغیر دار السّلام میں دیکھ پائیں گے۔

۱۱- اِس میں سوال یہ ہوگا کہ اگر مومنین اپنی رُوحِ علوی سے ہمیشہ دار السّلام ہی میں رہتے ہیں تو پھر یہ دُعا بار بار کیوں کی جاتی ہے؟ "..... اور تجھ ہی سے سلامتی ہے اور تیری ہی طرف سلامتی لوٹتی ہے، اے پروردگار! ہمیں سلامتی یعنی تائید کے ذریعہ زندہ کر دے اور سلامتی (تائید) کے گھر میں داخل فرما۔" اِس کا جواب یہ ہے کہ یقیناً ہر مومن کی رُوحِ علوی سلامتی کے گھر میں ہے، مگر وہ انائے سفلی سے اِس دُنیا میں آکر اپنی حقیقت کو یکسر فراموش کر بیٹھا ہے، اور اس کا ازالہ صرف علم و معرفت ہی سے ہو سکتا ہے، لہٰذا اِسے یہ دُعا سکھائی گئی ہے جس میں حقیقی علم مطلوب ہے کہ: "تُو نورِ تائید! تو تائید کی روشنی تجھ سے ہے اور یہ تائید کی روشنی ہماری انا کو لے کر تیری ہی طرف لوٹتی ہے، یا ربّ! ہمیں اِسی تائید سے زندہ کر دے اور سلامتی کے گھر میں اپنی انائے علوی سے ملا دے۔"

"انت السّلام ومنك السّلام والیك یرجع السّلام" کے بارے میں بعض احباب نے خواہش ظاہر کی تھی کہ یہ بندۂ کمترین اس کی وضاحت کرے، چنانچہ یہ مضمون خصوصاً اِسی وجہ سے لکھا گیا ہے، پس یہاں عرض یہ ہے کہ اِس دُعا کے ان مقدّس الفاظ میں سوال کا پیدا ہو جانا بظاہر ایک منطقی حقیقت ہے، کیونکہ ظاہری عقل کے نزدیک خُدا کے لئے "انت السّلام" کہنے کے بعد "ومنك السّلام" کہنا ایسا ہے جیسے کوئی کہتا ہو کہ: "تُو خُدا ہے اور تجھ سے خُدا ہے۔" مگر ہم سب کو پُورا پُورا یقین ہے کہ اس

کی تاویل حکمت کچھ اور ہے، اور وہ یہ ہے کہ ذاتِ سُبحان بحقیقت کسی صفت سے موصوف نہیں، مگر مجازاً، چُنانچہ السّلام سے النّور مُراد ہے جو اللہ تعالیٰ کا مجازی نام ہے، حقیقی نہیں، کیونکہ نُور اور ظلمت ایک دُوسرے کے مُتضاد ہیں، اور ذاتِ خُدا کی کوئی ضد نہیں، اِس کے سوا ہر چیز کی ایک ضد ہے، اور اضداد کے جوڑوں کو خُدا ہی نے بنایا ہے جیسے سورۃ یاسین (۳۶/۳۶) میں اس کا ذکر فرمایا گیا ہے، یہاں یہ کُلیّہ یاد رہے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ کسی صفت سے موصُوف نہیں، تاہم چند اسماء اس کی ذاتِ اقدس کے لئے منتخب ہیں، جیسے اللہ، سُبحان، رحمان وغیرہ، اِس قسم کے اسماء مخلوق کے لئے اِستعمال نہیں ہوتے، جبکہ دُوسرے بہت سے نام جو خُدا کے لئے حقیقی نہیں بلکہ مجازی ہیں، وہ مخلوق کے لئے بھی مُستعمل ہیں، چُنانچہ نُور اور سلام ایسے نام ہیں کہ خُدا اور مخلوقِ خُدا دونوں کے لئے آتے ہیں، اس کی مثال بھی قُرآن ہی سے مِل سکتی ہے، جیسے نُور کا اسم سُورۃ نُور (۲۴/۳۵) میں اللہ تعالیٰ کی صفتِ ہدایت کو ظاہر کرتا ہے اور سُورۃ مائدہ (۵/۱۵) میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو نُور کے اسم سے موسوم کیا جاتا ہے۔

۱۲۔ سلام نُورِ تائید کا نام ہے، اور یہ سب سے پہلے کلمۂ امر کی صُورت میں طلُوع ہو جاتا ہے، چونکہ اُس مقام پر جُملہ ازلی و ابدی حقائق و معارف ایک ہیں، لہٰذا کلمۂ باری کے بہت سے ناموں میں سے ایک نام "سلام" ہے جیسا کہ سُورۃ یاسین (۳۶/۵۸) میں ہے:-

سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِیْمٍ (۳۶/۵۸) پروردگارِ مہربان کا ایک قول (یعنی کلمۂ باری) نورِ تائید ہے۔ یہی نورِ انبیاء و آئمہ علیہم السّلام کو حاصل ہوتا رہا ہے، اور اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ۔ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ (۳۷/۱۸۰-۱۸۱) یہ لوگ جس طرح خدا کے بارے میں وصف بیان کرتے ہیں تمہارا ربّ جو عزّت کا پروردگار ہے وہ اس سے پاک و برتر ہے، اور پیغمبروں کو نورِ تائید حاصل ہوتا رہا ہے۔ اس میں تین عظیم حکمتوں کا ذکر ہے:۔

(الف) لوگ معرفت کے بغیر خدا کے جو اوصاف بیان کرتے ہیں، اُن سے خدا پاک و برتر ہے۔

(ب) وہ دینی، روحانی، اور عقلی عزّت کی پرورش کرتا ہے اور اسے بلند کر دیتا ہے۔

(ج) نورِ تائید انبیاء و آئمہ علیہم السّلام کو حاصل ہوتا ہے، اور وہی حضرات خدا کو پہچانتے ہیں۔

۱۳۔ قرآن حکیم میں خدا تعالیٰ اور فرشتوں کی جانب سے اہلِ ایمان پر درود کا ذکر موجود ہے (۳۳/۴۳) مگر عام حالت میں ان کو آسمانی سلام نہیں، ہاں یہ سلام ہدایت کی پیروی سے وابستہ اور مشروط ہے (۲۰/۴۷) اور پھر بہشت میں مومنین کو ایسا سلام حاصل ہوگا (۳۶/۵۸، ۱۳/۲۴) یہی وجہ ہے کہ ہر مومن کے حق میں علیہ السّلام نہیں کہا جاتا، مگر پیغمبر، امام، فرشتہ، مقرّب، اور اہلِ بیت کو، یہ سب کچھ اس لئے ایسا ہے کہ

سلام نُورِ تائید کو کہتے ہیں۔

۱۴۔ اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ جب بندۂ مومن کو موجُودہ حالت میں خُدا اور ملائکہ کی طرف سے کوئی سلام نہیں، اور کسی مومن کے حق میں علیہ السّلام بھی نہیں کہنا چاہیئے تو پھر مُسلمین و مومنین ایک دُوسرے کو "السّلامُ علیکُم وعلیکمُ السّلام" کیوں کہا کرتے ہیں؟ اِس کا جواب یہ ہوگا کہ خُدا کا سلام فرمانا ایک عملی سلامتی کے معنی کو ظاہر کرنے کے لئے ہے، جیسے کسی پیغمبر کے بارے میں سَلَامٌ عَلیٰ.... فرمانا، اور ایسی صُورت میں ہمیں بھی خُدا کی اِس رحمت کو اور کسی پیغمبر یا امام کی مرتبت کو سمجھنے کے لئے علیہ السّلام کہنا چاہیئے، مگر جہاں یہ فضیلت کسی دُوسرے اِنسان کو حاصل نہیں، تو وہاں ہمیں اس کے حق میں علیہ السّلام نہیں کہنا ہے، لیکن جہاں عام طور پر ایک دُوسرے کو سلام کیا جاتا ہے، اِس میں دُعا کے معنی ہیں، اور یہ دُعا ضرور کرنا ہے۔

۱۵۔ سُورۂ مریم (۱۹/۱۵، ۳۳) میں حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے رُوحانی جنم، نفسانی موت اور انبعاث کا جس شان سے ذکر فرمایا گیا ہے، اُس سے لفظ "سلام" کے معنی اور حکمت پر پُوری طرح سے روشنی پڑتی ہے، کہ اس مثال میں جسمِ خاکی کی سلامتی سے متعلق کوئی بات نہیں ہے، بلکہ یہ رُوح اور عقل کی سلامتی ہے، جو نُورانی تائید کی شکل میں ہے، اور یہاں یہ جاننا ضروری ہے کہ اِس مثال میں حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ تمام کامل اِنسانوں کی رُوحانیت کی نمائندگی کر رہے ہیں، کیونکہ سب کے لئے سلامتی کی راہ ایک ہی ہے، اِس کے برعکس اگر ہر پیغمبر کا طریقِ رُوحانیت الگ

ہوتا، تو اس کے ساتھ ساتھ (نعوذ باللہ) خدا کی سُنّتیں بھی جُدا جُدا ہوتیں، مگر اللہ کی سُنّت ایک جیسی چلی آرہی ہے، اور وہ یہ ہے کہ لوگوں کی رُوحانی پیدائش، نفسانی موت، اور انبعاث سب کچھ ہادیٔ زمان سے وابستہ ہے، کیونکہ وہی نفسِ واحدہ (۳۱/۲۸) اور سلامتی کا گھر ہے، اور یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ خداوندِ عالم لوگوں کو سلامتی کے گھر کی طرف بُلائے (۱۰/۲۵) اور وہ موجود نہ ہو، اور یہ بھی ناممکن ہے کہ کوئی شخص وسیلہ کے بغیر براہ راست خدا تک پہنچ جائے۔

۱۶۔ حضرت نوح علیہ السّلام ظاہری طوفان کے علاوہ ایک رُوحانی طوفان سے بھی گزر رہے تھے ..... جب وہ رُوحانیت کا طوفان تھم گیا، تو ارشادِ خداوندی ہُوا: قِيلَ يٰنُوحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ (۱۱/۴۸) حُکم دیا گیا اے نوحؑ ہماری طرف سے سلامتی (تائید) اور ان برکتوں کے ساتھ اُترو جو تم پر اور اُن لوگوں پر ہیں جو تمہارے ساتھ ہیں۔ سلام یعنی تائید بہت بڑی چیز ہوتی ہے، اِس لئے کامل اِنسانوں کو بڑی سختی سے آزمالیا جاتا ہے، پھر اس کے بعد نورانی تائید کی دولت سے نوازا جاتا ہے، آپ دیکھ سکتے ہیں کہ حضرت نوحؑ بڑے بڑے امتحانات سے گزر جانے کے بعد ربِّ کریم کے سلام (تائید) کو حاصل کرسکتے ہیں، اور اِسی طرح حضرت ابراہیمؑ بھی (۲۱/۶۹)۔

۱۷۔ اِس سلسلے میں کسی بھی ہوشمند کی طرف سے یہ سوال ہوسکتا ہے

کہ اِس آیۂ کریمہ میں حضرت نوحؑ کے بارے میں جیسا ارشاد ہُوا ہے، اس میں کیا حکمت پوشیدہ ہے؟ وترکنا علیہ فی الآخرین۔ سلٰمٌ علیٰ نوحٍ فی العٰلمین۔ انّا کذٰلک نجزی المحسنین (۳۷/۷۸-۸۰)

اِس کا جواب اِس وضاحت میں ہے: اور ہم نے آنے والے کامل اِنسانوں میں مرتبۂ نوحؑ کی پہچان باقی رکھی، اِس لئے کہ ہر عالمِ شخصی میں یہ طوفان برپا ہوتا رہے گا، اور ان عوالم میں ہمیشہ نوحؑ کو سلامتی اور تائید حاصل ہوتی رہے گی، اور ہم کامل انسانوں کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں۔

۱۸۔ عالمِ شخصی میں ہر عظیم پیغمبر کے رُوحانی معجزات وقوع پذیر ہُوا کرتے ہیں، اور اسی طرح ہر اُس پیغمبر کے مرتبۂ رُوحانی کی شناخت ہو جاتی ہے، جس کا قرآن میں کوئی ذکر موجود ہو، چُنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے بارے میں فرمایا گیا ہے: وترکنا علیہ فی الآخرین۔ سلٰمٌ علیٰ ابراھیم۔ کذٰلک نجزی المحسنین (۳۷/۱۰۸-۱۱۰) اور ہم نے آنے والے کامل اِنسانوں میں مرتبۂ ابراہیمؑ کی پہچان باقی رکھی، یعنی ہر شخصی عالم میں ابراہیمؑ کے معجزات ہوتے رہیں گے، یعنی حضرت ابراہیمؑ ہر پیغمبر اور امام میں اپنی مذہبی اور رُوحانی زندگی کا اعادہ کریں گے، اسی معنیٰ میں ان پر سلامتی اور تائید ہے، اور ہر پیغمبر کو یہی درجہ حاصل ہے۔

۱۹۔ ایک عام اِنسان اس بات کو تو آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ

عالمِ کثرت میں کس طرح چیزیں الگ الگ موجود ہوا کرتی ہیں، مگر اسے اِس حقیقت کو سمجھ لینا بہت ہی مشکل ہے کہ عالمِ وحدت میں کس طرح انبیاء اولیا (یعنی اُمّہ) علیہم السّلام ایک ساتھ موجود ہیں، اِس سلسلے میں اسے یہ جاننا چاہیئے کہ عالمِ وحدت بڑا عجیب و غریب اور پہچان کے لئے بہت ہی مشکل اِس لئے ہے کہ وہ ایک شخص کی شکل میں ہے، جس میں سب سے پہلے صالحین جمع ہیں، اور یہی سلامتی کا گھر ہے، جیساکہ قرآنِ پاک کا ارشاد ہے: والّذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰتِ لندخلنّھم فی الصّٰلحین (۲۹/۹) اور جن لوگوں نے ایمان لایا (جیساکہ اِس کا حق ہے) اور اچھے اچھے کام کئے (جیساکہ کرنا چاہئے) ہم انہیں ضرور نیکوکاروں میں داخل کردیں گے۔ یعنی وہ ہادیٔ برحق علیہ السّلام کے عالمِ شخصی میں داخل ہوسکیں گے، کیونکہ یہی دارالسّلام ہے، اور اسی مقام پر زمانۂ ماضی کے جملہ صالحین (نیکوکار) جمع ہیں، اگر یہاں اس مثال کو قبول کرلیا جائے کہ جس طرح قرآنی حکمت کی زبان میں "فی الکتاب" کا ترجمہ "اوراق کی سطح پر" نہیں ہوسکتا، بلکہ اِس سے الفاظ کی معنویت اور اس کی گہرائی مُراد ہے، اِسی طرح "فی الصّالحین" سے کامل اِنسانوں کی ظاہری قربت و ہم نشینی مُراد نہیں، بلکہ ان کے عالمِ شخصی میں داخل کردینا مقصود ہے۔

۲۰۔ قرآنِ حکیم میں جو لازوال اور اٹل قوانین ہیں، اُن میں سے ایک عالی شان قانون یہ بھی ہے کہ اللہ کی چیزیں دراصل منتشر اور تتر

بتر نہیں، بلکہ خُدائی خزانوں میں منظّم ہیں، اِس دُنیا کی تمام اشیأ خزائنِ خُدا سے آتی ہیں (۱۵/۲۱) اِس قانون کے مطابق بہشت بھی خزانے کے طور پر ہے، اور اس پر خُدا تعالیٰ کی طرف سے خزانچی مقرّر ہیں، خزانچی کو عربی میں خازن کہتے ہیں، اور اس کی جمع خَزَنَۃ ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا پاک ارشاد ہے: وقال لھم خزنتھا سلٰمٌ علیکم طِبتم فادخلوھا خٰلدین (۳۹/۷۳) اور اس (بہشت) کے خزانچی اُن سے کہیں گے تُم پاک و پاکیزہ ہوئے تم بہشت میں ہمیشہ کیلئے داخل ہو جاؤ۔ بہشت کے خزانچی ائمہ آلِ محمدؐ ہیں، اور بہشت ان کے عوالم شخصی ہیں، یعنی ہر امام کا عالمِ شخصی اپنے وقت کے لوگوں کے لئے جنّت ہے، پس اِسی معنیٰ میں امامِ زمانؑ دارالسّلام یعنی سلامتی اور تائید کا گھر ہے۔

یہاں یہ قانونِ خُداوندی بھی یاد رہے کہ ممثول یعنی حقیقت ایک ہی ہے، مگر اس کی مثالیں بہت ہیں، جیسے ارشاد ہے کہ کائنات و موجُودات کی تمام چیزوں کو خُدا کی کُرسی نے گھیر لیا ہے (۲/۲۵۵) ہر چیز ایک کتاب میں محدُود ہے (۶۸/۲۹) نامۂ اعمال میں تمام چیزیں درج ہیں (۱۸/۴۹) کُل چیزیں امامِ مُبین میں ہیں (۳۶/۱۲) اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں کو گن کر عددِ واحد میں سما لیا ہے (۷۲/۲۸، ۱۹/۹۴) ہر چیز لوحِ محفوظ میں ہے (۶/۵۹) آسمان و زمین یعنی کُل کائنات و موجُودات دستِ خُدا میں ہیں (۲۱/۱۰۴، ۳۹/۶۷) تمام ممکن اشیاء خُدا کے خزانوں میں ہیں (۱۵/۲۱) سب لوگ خُدا کے حضور میں

حاضر ہوں گے (۳۶/۳۲) اور اُس نے دے دیا سب کچھ جو کچھ تم نے مانگا (۱۴/۳۴) یہ بڑی بڑی مثالوں کے نمونے ہیں، اور ان سب کی حقیقت امامِ عالی مقام صلوات اللہ علیہ کی ذاتِ اقدس ہے، جو خانۂ خدا کی مرتبت میں سلامتی اور نورانی تائید کا گھر ہے، کیونکہ اللہ و رسولؐ کی اطاعت انہیں کے وسیلے سے انجام پاتی ہے، اور یہی اِس دُنیا میں خلیفۂ خدا اور نمائندۂ پیغمبرِ اکرمؐ ہیں، الحمدُ للہ ربّ العالمین۔

نوٹ :- ہر آیت کے ماقبل اور مابعد کو قرآنِ پاک میں دیکھا کریں، اور ہر مضمون میں ایسا کریں، تاکہ قرآن فہمی میں مدد ملے، اور معلومات میں اِضافہ ہو۔

خاکِ راہِ جماعت
نصیرُ الدّین نصیر ہونزائی
لندن : ۲۰ر جولائی ۱۹۸۴ء

مقاماتِ نور

۱- اس میں کوئی شک نہیں کہ : اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کا نور ہے (۲۴/۳۵) لیکن یہ بات انتہائی ضروری ہے کہ ہم اِس سِرِّ عظیم کے بارے میں خُوب سوچیں اور اپنے آپ سے سوال کریں کہ وہ کون سا عالم ہے، جس کے آسمان و زمین کو خُدا کا نور براہِ راست جگمگا رہا ہے ؟ کیا یہ دُنیائے ظاہر ہے یا عالمِ باطن ؟ آیا یہ عالمِ دین ہے یا عالمِ شخصی ؟

اِس کلیدی سوال کا دُرست جواب یہ ہے کہ اِس مادّی کائنات میں عالمِ دین ہے، عالمِ دین میں عالمِ شخصی ہے اور عالمِ شخصی میں خُداوند تبارک و تعالیٰ کا پاک نُور جلوہ افروز ہے، اور یہاں عالمِ شخصی سے ہادیٔ برحق کی مُبارک ہستی مُراد ہے، جو مظہر و مطلعِ نورِ خُدا ہے، جس سے عالمِ دین کے آسمان و زمین روشن ہو جاتے ہیں، اور ظاہری دُنیا کو درجہ بدرجہ روشنی ملتی ہے۔

۲- ربِ عزّت نے سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السّلام کو نورِ مطلق کا مظہر قرار دیا، وہاں یہ نور رُوحِ خُداوندی کے نام سے تھا، جیسے سورۃ حجر (۱۵/۲۹) اور سُورۃ صٓ (۳۸/۷۲) میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

فَاِذَا سَوَّیتُہٗ وَنَفَختُ فِیہِ مِن رُّوحِی فَقَعُوا لَہٗ سٰجِدِینَ (۳۸/۷۲) تو جب میں اس کو (مقامِ رُوح اور مقامِ عقل پر) درست کرلوں اور اس میں اپنی رُوح (کلمۂ کُن) پھُونک دوں تو تم سب کے سب اس کے سجدہ کے لئے گر پڑنا۔ اِس تعلیمِ ربّانی میں لفظ "سَوَّیتُہٗ" کا خُدائی فعل منازلِ رُوحانیت سے بلند ہوکر نُورِ عقل (عرش) پر پہنچا ہُوا ہے، اِس لئے کہ خُدا کی رُوح جو کلمۂ باری میں ہے اِسی مقام پر پھُونک دی جاتی ہے۔

۳۔ سوال: قُرآنِ حکیم میں دو قسم کی روشنی کا ذکر ہے، ایک کا نام ضِیاء ہے اور دُوسرے کو نُور کہا گیا ہے (۱۰/۵) آپ وضاحت کے ساتھ بتائیں کہ حضرت آدمؑ میں کونسی روشنی تھی؟ اور دو الگ الگ روشنیاں کیوں ہیں؟

جواب: روشنی بحقیقت ایک ہی ہے، تاہم یہ کلمۂ باری کی نسبت سے ضیاء کہلاتی ہے، اور جب یہ عقل میں منتقل ہو جاتی ہے، تو اس کو نُور کہا جاتا ہے، جیسے اِس حقیقت کو سمجھانے کیلئے قرآنِ حکیم میں سُورج کو ضِیاء اور چاند کو نُور کہا گیا ہے (۱۰/۵) جس کی وجہ ظاہر ہے کہ سُورج کی روشنی ذاتی ہے، مگر چاند کی روشنی ذاتی نہیں بلکہ سُورج سے آرہی ہے، اور حضرت آدمؑ کے عالمِ شخصی میں ایک طرف کلمۂ باری کا آفتاب ضیاء پاشی کر رہا تھا، اور دُوسری طرف عقل کا ماہتاب نُور بکھیر رہا تھا۔

۴۔ حضرت نوح علیہ السّلام کو بھی پروردگارِ عالم نے خُدائی رُوح و

نورُ کا مرتبہ عنایت کر دیا تھا، چنانچہ آپؑ کی ذات میں نورانیت کی کشتی کا تذکرہ قرآنِ پاک میں اس طرح فرمایا گیا ہے: واصنع الفلک باعیننا ووحینا (۱۱/۳۷) اور کشتی ہمارے جواہر اور ہماری وحی سے بناؤ۔ عین کے بہت سے معنی ہیں، اور ان میں سے ایک معنی جوہر کے ہیں، پس اعین کے معنی جواہر ہیں یعنی ذواتِ اشیاء، جو مقامِ عقل کے حقائق ہیں اور وحی سے کلمۂ باری مُراد ہے، اِسی سلسلے کا دُوسرا ارشاد یہ ہے: وحملنٰہُ علیٰ ذات الواحٍ ودُسُرٍ تجری باعیننا جزآءً لمن کان کُفِرَ (۵۴/۱۳-۱۴) اور ہم نے نوحؑ کو ایک کشتی پر جو تختوں اور کیلوں سے تیار کی گئی تھی سوار کیا۔ تختوں سے کلمۂ باری کے ظہورات اور کیلوں سے نورِ عقل کے مظاہر سے مُراد ہیں اور وہ کشتی حقائقِ اشیاء کے مطابق چلتی تھی تاکہ نافرمان لوگ جو اس سے باہر تھے طوفانِ جہالت سے ہلاک ہو جائیں۔

۵- اِسی سلسلے میں یہ بھی ارشاد ہے: وقیل یٰارضُ ابلعی مآءکِ ویٰسمآءُ اقلعی وغیض المآءُ وقضی الامر واستوت علی الجودیِّ وقیل بُعدًا لِّلقوم الظّٰلمین (۱۱/۴۴) اور جب (خُدا کی طرف سے) حُکم دیا گیا کہ اے زمین اپنا پانی جذب کر لے اور اے آسمان (برسنے سے) تھم جا اور پانی گھٹ گیا اور امر پُورا کیا گیا اور کشتی کوہِ جُودی پر جا ٹھہری اور کہا گیا کہ ظالم لوگوں کو (خُدا کی رحمت سے) دُوری ہے۔ اس کی تاویل یہ ہے کہ شخصیت کی رُوحیں

بحکمِ خُدا بدن میں جذب ہوگئیں اور باہر کی ارواح واپس پرواز کرگئیں اور اسی طرح طوفانِ رُوحانیت کا پانی گھٹ گیا اور کلمۂ امر کا ظہور ہُوا، جس کے ساتھ ساتھ رُوحانیت اِنتہا کو پہنچ گئی اور کشتی اب کوہِ عقل پر جاکر ہمیشہ کیلئے ٹھہر گئی، اب ایسی حالت میں حضرت نوحؑ اور مومنین اللہ تعالیٰ کی رحمت کو حاصل کر رہے تھے، جبکہ دُوسرے لوگ اِس سے بہت ہی دُور تھے، اِس سے معلوم ہُوا کہ حضرت نوحؑ میں وہی نُور تھا جو قبلاً حضرت آدمؑ میں تھا، ہر چند کہ دونوں عظیم المرتبت ہستیوں سے متعلق تذکرہ کے الفاظ الگ الگ ہیں، مگر حقیقت اور نُور ایک ہی ہے۔

۶۔ وہ نُورِ ہدایت جو رُوحِ خُداوندی کے نام سے حضرت آدمؑ کی پیشانی میں داخل ہُوا تھا، اور جس کو آیۂ اصطفاء (۳/۳۳) کے مطابق اولادِ آدمؑ کے سلسلۂ انبیاء و ائمۂ علیہم السّلام میں ہمیشہ جاری و باقی رہنا تھا، وہ نسلاً بعد نسلٍ حضرت ابراہیم علیہ السّلام میں جلوہ افروز ہُوا، جس طرح قرآنِ کریم میں ارشاد ہے: جب ابراہیم کو ان کے ربّ نے چند کلمات میں آزمایا اور اُنہوں نے پُورا کر دیا تو خُدا نے فرمایا میں تم کو لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہُوں (حضرت ابراہیمؑ نے) عرض کی اور میری ذرّیت میں سے بھی، فرمایا (ہاں مگر) میرے اِس عہد پر ظالموں میں سے کوئی شخص فائز نہیں ہوسکتا (۲/۱۲۴) اِس فرمانِ الٰہی میں ہمیں فی الوقت جس حقیقت کی تلاش

ہے وہ "کلمات" سے متعلق ہے، کہ ان میں اسماء بھی تھے اور کلمات بھی، جن کو حضرت ابراہیمؑ نے یکے بعد دیگرے متکمل کر لیا، اور ان کلمات کے آخر میں لازماً کلمۂ باری بھی تھا، جو روشنی کا اصل سرچشمہ ہے، جہاں روحانی سفر کی منزلِ مقصود ہے، اور جس میں سب کچھ ہے۔

۷۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقام نورانیت بھی وہی تھا جس پر پہلے حضرت آدم، حضرت نوح اور حضرت ابراہیم علیہم السّلام فائز ہو چکے تھے، جیساکہ ارشادِ ربّانی کا ترجمہ ہے: اور جب موسیٰؑ ہمارا مقرّر وقت پورا کرنے کے لئے (کوہِ طور) آئے اور ان کا پروردگار ان سے ہمکلام ہوا تو موسیٰؑ نے عرض کی کہ خدایا تو مجھے اپنا دیدار دے کہ میں تجھے دیکھوں خدا نے فرمایا تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے مگر ہاں اِس پہاڑ کی طرف دیکھو (میں اِس پر تجلّی ڈالتا ہوں) پس اگر پہاڑ اپنی جگہ پر قائم رہے تو البتہ مجھے دیکھ لوگے پھر جب ان کے پروردگار نے پہاڑ پر تجلّی ڈالی تو اس کو ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰؑ بیہوش ہو کر گر پڑے پھر جب ہوش میں آئے (یعنی تاویل آئی) تو کہنے لگے خدایا تو پاک و پاکیزہ ہے میں تیری طرف لوٹ آیا اور میں سب سے پہلے (ان حقائق کا) یقین کرتا ہوں (۱۴۳)۔

حضرت موسیٰ علیہ السّلام کو ایک اعتبار سے رُویت ہوتی تھی، اور دوسرے اعتبار سے نہیں ہوتی تھی، اِس میں اشارہ یہ تھا کہ ہمیشہ خداوندِ عالم کی عقلی و علمی تجلّیوں کا نظارہ کیا جاتے، یہی سبب تھا کہ پروردگار نے نورِ علم و حکمت کی تجلّی کو عقل پر ڈالی اور اس کے لاتعداد جواہر بنا دیئے، اور حضرت

موسیٰؑ کو اس دائمی دیدار کی طرف متوجہ فرمایا، اور ہر گوہر کو ایسی جلا دی گئی کہ اگر علم و عرفان کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس میں جلوۂ طور کا عکس نظر آئے۔

عقلی اور علمی دیدار ایک قرآنی حقیقت ہے، انشاء اللہ تعالیٰ، اس آیۂ پُرحکمت میں ذرا غور کرنے سے آپ حضرات کو بیحد خوشی ہوگی، اور وہ ارشادِ خداوندی یہ ہے: وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ط اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (۲/۱۱۵) مشرق و مغرب دونوں خدا ہی کے ہیں پس تم جہاں کہیں رُخ کرو وہیں خدا کا چہرہ موجود ہے بیشک خدا بڑا کشائش والا خوب دانا ہے۔ اس کی تاویل یوں ہے کہ دنیائے قرآن سب کی سب خدا ہی کی ہے، لہٰذا تم جس آیۂ کریمہ کے باطن کو چاہو دیکھ لو، اسی مقام پر چہرۂ خدا کا ایک عقلی جلوہ اور علمی دیدار ہوگا، کیونکہ خدائے حکیم نے اپنی کتابِ عزیز کو علمی معجزات سے آراستہ فرمایا ہے، یقیناً وہ وسیع علم کا مالک ہے۔

۸۔ یہ بات حقائق میں سے ہے کہ حضرت عیسےٰ علیہ السّلام میں وہی خدائی رُوح جلوہ فگن تھی، جو پہلے پہل حضرت آدم علیہ السّلام میں پھونک دی گئی تھی، جس کا ظہور کلمۂ باری سے ہوتا ہے، چنانچہ آپ اس قرآنی تعلیم سے بخوبی اندازہ کر سکیں گے کہ جن کامل انسانوں میں رُوح القدس آتی ہے، اُن سے کیسے کیسے معجزات ظہور پذیر ہو سکتے ہیں، ملاحظہ ہو: جب خدا فرمائے گا کہ اے مریمؑ کے بیٹے عیسیٰؑ ہم نے جو

احسانات تم پر اور تمہاری ماں پر کئے انہیں یاد کرو جب ہم نے رُوح القدس سے تمہاری تائید کی کہ تم مہد (گہوارہ) میں اور اُدھیڑ ہو کر لوگوں سے باتیں کرنے لگے اور جب ہم نے تمہیں الکتاب اور حکمت اور توریت و انجیل سکھائیں، اور جب تم میرے اذن سے مٹی سے پرندے کی مورت بناتے پھر اس میں پھونک دیتے تو وہ میرے اذن سے پرندہ بن جاتا تھا، اور تم میرے اذن سے مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کر دیتے تھے اور جب تم میرے اذن سے مُردوں کو (زندہ کر کے قبروں سے) نکال کھڑا کر دیتے تھے (۵/۱۱۰)۔

حضرت عیسیٰؑ کے مذکورہ معجزات کی تاویل اِس طرح سے ہے کہ جن حدُودِ دین کے عالمِ شخصی میں آپؑ کا نُورانی جنم ہُوا تھا، ان کے ہاں آپؑ پیدا ہوتے ہی بولنے لگے تھے، یہ سلسلہ جاری تھا، پھر حضرت عیسیٰؑ اُدھیڑ ہو کر اُن حضرات کے باطن میں رُوحانی معجزات دکھانے لگے، الکتاب وہ زندہ نُور ہے، جس کی آیات قلم، لوح، اور رقیم ہیں، اسی میں حکمتِ بالغہ اور جُملہ آسمانی کتابیں یکجا ہیں۔

حضرتِ عیسیٰؑ حدُودِ دین کو اسمِ اعظم عنایت کرتے تھے، اسمِ اعظم کا ایک قُرآنی نام اذن اللہ ہے، جس کی بدولت مقامِ عزرائیلؑ پر شخصیّت سے مورت اور سانچے کا کام لے کر اس میں رُوحِ قدسی ڈالی جاتی تھی، جس سے اُس شخص جیسا ایک فرشتہ پیدا ہو کر پرواز کر جاتا تھا۔

مادر زاد اندھے کو بصارت دینا یہ ہے کہ کسی گم گشتہ انسان کو راہِ راست پر لایا جاتا تھا، صرف یہی نہیں بلکہ اسے خُدا کے اذن سے چشمِ باطن بھی عطا ہو جاتی تھی، کوڑھی یعنی وہ شخص جس میں کوڑھ کی بیماری ہو، اس سے ایسا آدمی مُراد ہے، جو روحانیت کی ابتدائی روشنی میں عرصۂ دراز سے پڑا ہو، اور جس کو احساس ہی نہ ہو کہ اصل رُوحانیّت کی منزلیں تو اِس سے آگے ہیں، اور خاص کر وہ شخص، جس نے یہ روشنی ہادیٔ برحق کی ہدایت کے بغیر دیکھی ہو[1]، ایسے لوگوں کو حضرت عیسےٰؑ منازلِ رُوحانیّت کی طرف آگے بڑھا دیتے تھے، اور یہ ہُوا کوڑھی کو اچھا کر دینا، اور مُردوں کو زندہ کر کے قبروں سے نکالنا یہ ہے کہ حضرت عیسےٰؑ پر جب انفرادی قیامت گزر رہی تھی، تو اس میں شخصیّت کی زندہ قبرستانوں سے ذرّاتِ رُوح زندہ ہو کر آپ کی طرف آتے تھے۔

۹۔ سرورِ انبیاء حضرت محمّد مُصطفےٰ رسُولِ خُدا صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے

---

[1] : اگر کوئی شخص ہادیٔ برحق کے لئے انتظار اور اُس کی رہنمائی کے بغیر کوئی سخت ریاضت کرتا ہے، جسے انگریزی میں MYSTIC EXERCISE کہتے ہیں، تو بیشک وہ رُوحِ حیوانی کی تحلیل کی روشنی کو دیکھ سکتا ہے، مگر یہ وہ مقام ہے جہاں گمراہی کی انتہا ہو جاتی ہے کہ اکثر لوگ اس کو خُدا کا نُور سمجھ بیٹھتے ہیں۔

مِن اللّٰہ نُور (۵/۱۵) اور سراج مُنیر (۳۳/۴۶) ہونے میں کسی فردِ مُسلم کو کیا شک ہو سکتا ہے، اور اہلِ دانش کے نزدیک یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ حضورِ انورؐ جمیع انبیاء و مُرسلین میں اشرف و افضل تھے، اور اس فضیلت و مرتبت کی کئی وجُوہ ہیں، تاہم صراطِ مُستقیم (راہِ رُوحانیت) اور منزلِ مقصود سب پیغمبروں اور ساری اُمتوں کے لئے یکساں ہے، جیسا کہ اِس فرمانِ الٰہی سے یہ قانون ظاہر ہو جاتا ہے:

اِنّا اوحینا اِلیک کما اَوحینا الی نوحٍ والنّبیّٖن مِن بعدہٖ (۴/۱۶۳)، اے رسولؐ، ہم نے تمہارے پاس (بھی) تو اسی طرح وحی بھیجی ہے جس طرح نوحؑ اور ان کے بعد والے پیغمبروں پر بھیجی تھی۔ پس معلوم ہُوا کہ حضراتِ انبیاء علیہم السّلام کے لئے طریقِ وحی اور اس کے مراحل ایک جیسے ہُوا کرتے ہیں، آپ اِس فرمانِ خُداوندی میں بھی غور کر سکتے ہیں:-

وَمَا کَانَ لِبَشَرٍ اَن یُّکَلِّمَہُ اللّٰہُ اِلّا وَحیاً۔ اور کسی آدمی کے لئے ممکن نہیں کہ خُدا اس سے کلام کرے مگر وحی کے ذریعہ سے۔ وحی کے خاص معنی اشارہ کے ہیں، چُنانچہ اِس اشارہ کی تین بُنیادی قسمیں ہیں، اوّل رُویت (دیدار)، جو سب سے بڑا اشارہ ہے، دوم قولی اشارہ، جیسے کلمۂ باری، جس میں لاتعداد معنوی اِشارات پوشیدہ ہیں، اور سوم عملی اشارہ، جس طرح مظاہرۂ قلم ہے، جس میں بیشمار مثالیں موجُود ہیں، اَو مِن وّرائِ حجاب۔ یا پردہ کے پیچھے سے۔ پردہ کا مطلب یہ ہے

کہ اس دُوسرے درجہ کے کلام میں رُویت نہیں صرف نورِ خُدا کی آواز ہے۔
اَویُرسِلَ رسولاً فَیُوحِیَ بِاِذنِہٖ مایشاء ط اِنّہٗ علیٌّ حکیم
(۴۲/۵۱) یا کوئی فرشتہ بھیج دے پس وہ فرشتہ خُدا کے اذن و منشاء کے
مطابق وحی کرتا ہے، بیشک وہ عالیشان حکمت والا ہے۔ یہ کلام کرنے
کا تیسرا درجہ ہے، اور یہاں یہ بات یاد رہے کہ لفظ وحی کا اطلاق تنزیل
کے تمام مدارج پر ہوتا ہے، کیونکہ ہر ہر آیت میں معنوی اور تاویلی شانہ
موجود ہوتا ہے، اگرچہ وحی کا اطلاق مقامِ اعلیٰ پر انتہائی خصوصیت کے
ساتھ ہوا ہے۔

وحی اور کلامِ خُداوندی کا مذکورہ قانون جملہ انبیاء علیہم السّلام
کے لئے مُشترک تھا، لہٰذا اِسی کے مطابق آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم
کی طرف امرِ باری تعالیٰ (کلمہ کُن) سے رُوحِ قرآن وحی کی گئی حقیقت
میں یہ وہی رُوح ہے، جو شروع شروع میں حضرت آدم علیہ السّلام میں
پھُونک دی گئی تھی، اور آپ قرآنِ حکیم (۴۲/۵۲) میں دیکھ سکتے
ہیں کہ یہی پاک رُوح زندہ روشنی (نُور) بھی ہے، یہ سوچنے کی بات
ہے کہ قرآنِ کریم کی نورانیت ایک زندہ شخصیت سے کیوں وابستہ
رہی، اس میں عظیم حکمت پوشیدہ ہے، اگر اللہ چاہتا تو قرآنِ پاک
کو بصورتِ رُوح و رُوحانیت آنحضرتؐ کے قلبِ مُبارک پر نازل نہ
فرماتا (۲۶/۱۹۴) بلکہ یہ رُوح کے بغیر ایک ظاہری بنی بنائی کتاب
کی شکل میں آپؐ کے دستِ مُبارک پر دیا جاتا، لیکن ایسا نہیں کیا گیا،

بلکہ قرآن ایک ایسے نور کے ساتھ نازل ہوا کہ وہ اپنی قدسی زبان سے بولتا تھا، پھر قرآنِ عزیز تحریری صورت میں لایا گیا، اور نورِ پیغمبرِ خدا کی پاک ذات میں قائم رہا، لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ آیا رحمتِ عالمؐ کی جسمانی رحلت کے ساتھ ساتھ قرآن کے نور کو بھی بجھ جانا چاہیئے؟ نہیں نہیں، ہرگز نہیں، یہ بات خدا کے منشاء کے خلاف ہے، بس حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے نورِ قرآن کو ہمیشہ کے لئے سلسلۂ ائمہء آلِ محمدؐ میں منتقل کر دیا، تاکہ اس کی عزیز کتاب (قرآن) کے ساتھ ساتھ نور بھی اس دنیا میں جاری و باقی رہے، اور دینِ فطرت کا اصول یہی ہے۔

۱۰۔ حضورِ اکرمؐ کی روحانی اور عرفانی مرتبت کی ایک مثال پیش کرنے کیلئے سورۂ نجم (۵۳) کی کچھ حکمتیں بیان کی جاتی ہیں، یہاں سب سے پہلے ظہورِ حضرت مبدعؐ کی تشبیہ ستارے کے گرنے سے دی گئی ہے، اور اللہ نے اسی عظیم الشان معجزے کی قسم کھائی ہے، کہ مبدعؐ بطریقِ ابداع آنحضرتؐ کے سامنے جلوہ نما ہو گیا، اور "ما ضلّ صاحبکم" میں جس طرح رحمتِ عالمؐ کے عروج و ارتقاء کی تعریف و توصیف کی گئی ہے اس میں مذکورہ مقام تک آپؐ کی ہدایت و رہنمائی اور مومنین کی رسائی کا اشارہ بھی ہے، کیونکہ انبعاث مومنین کی منزلِ آخرین ہے۔

"علّمہ شدید القوٰی" میں کسی زبردست طاقت سے بیشتر خدا کے علمِ قاہرہ کا ذکر ہے، اور ذو مرّۃٍ کا مطلب صاحبِ مرآت ہے،

(یعنی کسی کام کا بار بار کرنیوالا) فاستوای میں فعلِ ابداع کا ذکر ہے، یعنی مُبدِع وہ ہے جو اِبداع کا کام بار بار کر سکتا ہے، وہ نورانیّت میں ظاہر ہُوا، اس کے بعد نزدیک ہو گیا، اور انائے عُلوی انائے سفلی میں اُتر گئی، اور اس کا نظریّہ یہ ہُوا کہ یہ دونوں دو کمان کی طرح بھی ہیں اور دائرے کی طرح بھی، جیسے اِس مثال سے یہ حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے :-

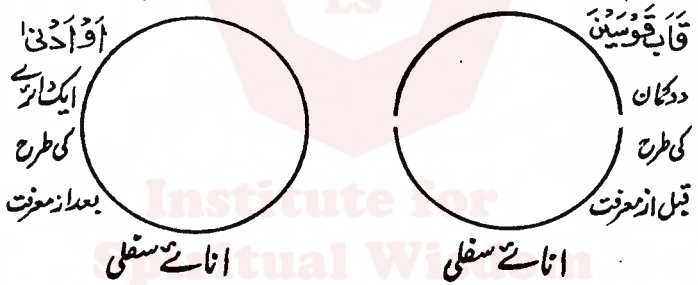

اِس واقعہ میں بہت سے دُور رس اشارے تھے، پیغمبرِ اسلامؐ کو یہی رُویت پھر بچشمِ باطن دُوسری دفعہ سِدرۃ المنتہیٰ کے پاس ہُوئی، جس کے پاس جنت الماویٰ ہے، جبکہ وہ درختِ سِدرہ بار بار ایک خزانے کو دکھا رہا تھا اور چھپا رہا تھا، یہ جلوہ ایسا نہ تھا کہ اس کو چھوڑ کے نظر کسی اور طرف مائل ہو جاتے، اور نہ حد سے آگے بڑھنے کے لئے کوئی حد تھی، آپؐ نے اپنے پروردگار کے اِنتہائی عظیم معجزات کا مشاہدہ کیا (۵۳-۱۸)۔

۱۱۔ قرآنِ حکیم میں سب سے روشن اور درخشاں حقیقتیں نُور سے متعلق ہیں، اور سب سے زیادہ قابلِ فہم مثالیں نُور کے بارے میں ہیں،

جس کا سبب خود نور کا وجود اور اس کی اہمیت و افادیت ہے، اس کی وضاحت یہ ہے کہ جس طرح آفتاب عالم تاب کائنات کی تمام مادّی فیوضات کا منبع ہے، اسی طرح نورِ عالمِ دین کی جملہ برکتوں کا سرچشمہ ہے، پھر یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ نور کبھی موجود ہو اور کبھی نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ کائنات کی بلندی و پستی کا نور ہے، پھر ارشاد ہوتا ہے کہ اس کے نور کی مثل ایک طاق کی طرح ہے جس میں ایک چراغ روشن ہو، ہمیں اس پُر حکمت ربّانی تعلیم کے سلسلے میں طاق اور چراغ کے اشارات کو سمجھے بغیر آگے نہیں چلنا چاہیئے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس مثال میں نورِ خدا کی اوّلین نسبت طاق کو حاصل ہے، پھر اس طاق میں ہونے کی وجہ سے چراغ کو بھی یہ نسبت مل جاتی ہے، اس کے یہ معنی ہوئے کہ اللہ کے خانۂ باطن کا طاق سب سے بلند ترین درجہ ہے جو خدا کے تصوّر اور بادشاہی کی طرح قدیم ہے، اور اس درجے پر بحکمِ خدا انبیاء و ائمہ علیہم السّلام یکے بعد دیگرے فائز ہوتے آئے ہیں، جیسے آنحضرتؐ کے وجودِ مبارک سے اس حقیقت کا ایک درخشاں ثبوت مل جاتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ آنحضرتؐ اپنے وقت میں ایک روشن چراغ (۳۳/۴۶) تھے، تو کیا کوئی دانشمند یہ کہہ سکتا ہے کہ اس وقت خانۂ خدا کے طاق میں جو چراغ نور بکھیر رہا تھا، وہ چراغِ مصطفوی سے الگ تھا؟ ہرگز نہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ پیغمبرِ خدا جس طرح سارے جہانوں کے لئے رحمت تھے (۲۱/۱۰۷) اسی طرح بمرتبۂ نورِ خدا آپ علیہ السّلام آسمانوں اور زمین کی روشنی تھے،

کیونکہ جہاں آپؐ کے وسیلے سے خُدائی رحمت سب کو پہنچتی ہے، وہاں آپؐ کے توسّط سے تمام عوالم کو نُور بھی پہنچ سکتا ہے، اِس حقیقت کے برعکس قرآنِ پاک میں کوئی ایسا تصوّر نہیں کہ جس سے ہم ذاتِ خُدا کو نُور مانیں اور یہ بات سب جانتے ہیں کہ یہ آیت مثال ہے، ممثول نہیں، اور ممثول (حقیقت یا تاویل) یہی ہے جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ اِس دُنیا میں جو کامل انسان خُدا کی جانب سے ہادیٔ برحق، خلیفہ، خُدا یا خلیفہ رسُولؐ، مظہرِ خُدا، مُفسّرِ آنِ ناطق، وارثِ کتاب اور زندہ اسمِ اعظم ہے، اِسی کی عقل کو اللہ تعالیٰ نے چراغِ ہدایت بنا کر طاقِ عزّت و برتری میں رکھا ہے، اور خُدا کا نُور قرار دیا ہے۔

آیئے اب ہم آیۂ نُور کے پُورے الفاظ میں دیکھتے ہیں، اُس حِکمت آگین ارشاد کا ترجمہ یہ ہے: خُدا آسمانوں اور زمین کا نُور (روشنی) ہے اِس کے نُور کی مثل ایسی ہے جیسے ایک طاق ہے جس میں ایک روشن چراغ ہو (اور) چراغ ایک شیشے کی قندیل میں ہو (اور) قندیل گویا موتی کا ایک ستارہ ہے (وہ چراغ) زیتون کے ایسے مبارک درخت (کے تیل) سے روشن کیا جائے جو نہ مشرق کی طرف ہو اور نہ مغرب کی طرف، اِس کا تیل ایسا ہے کہ اگرچہ آگ اُسے چھُوئے بھی نہیں تاہم وہ خود بخود روشن ہو جاتا ہے، یہ نُور پر نُور ہے، خُدا اپنے نُور کی طرف جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے اور خُدا لوگوں کے لئے مثالیں بیان کرتا ہے اور خُدا تو ہر چیز کو جانتا ہے (۳۴/۳۵)۔

۱۲۔ سورۂ نمل میں ارشادِ خُداوندی ہے: فلمّا جاءَ ھا

نُودِیَ اَن بُورِکَ مَن فِی النَّارِ وَمَن حَولَهَا وَسُبحٰنَ اللّٰہِ رَبِّ العٰلَمِینَ (۲۷/۸) غرض جب مُوسیٰؑ اِس آگ کے پاس آئے تو اُن کو ندا کی گئی کہ برکت دیا گیا ہے وہ جو آگ میں ہے اور جو اِس کے گرد ہے، نیز یہ ترجمہ بھی درست ہے: برکت دیئے گئے ہیں وہ جو آگ میں ہیں اور جو اس کے گرد ہیں۔ کیونکہ "مَنْ" واحد اور جمع دونوں کے لئے آتا ہے، یہ کوئی مادی قسم کی آگ نہیں تھی، بلکہ نُور تھا، آپ اِس سلسلے میں سورۂ طٰہٰ (۲۰/۱۰-۱۲) اور سورۂ قصص (۲۸/۲۹-۳۰) میں بھی دیکھیں، لیکن پھر وہی سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ آیا یہ نُور خود سُبحان تھا؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ نہیں، کیونکہ اس کو برکت دی گئی تھی، اور خُدا وہ ہے جو برکت دیتا ہے، مگر وہ برکت لینے سے پاک و بے نیاز ہے، پس وہ نُور مظہرِ خُدا تھا، جس کی نمائندگی کے پیشِ نظر خُدا ہر وقت کہہ سکتا ہے کہ "یہ نُور میں ہُوں" اور آیاتِ نُور جو قرآنی خزانوں کی کلیدیں ہیں، اُن کا سب سے بڑا راز یہی ہے۔

۱۲۔ سورۂ انعام (۶/۱۲۲) میں فرمایا گیا ہے: کیا جو شخص پہلے مُردہ تھا پھر ہم نے اُس کو زندہ کیا اور اس کے لئے ایک نُور بنایا جس کے ذریعہ سے وہ لوگوں میں چلتا ہے اُس شخص کا سا ہو سکتا ہے جو اندھیروں میں پھنسا ہُوا ہے کہ وہاں سے نکل ہی نہیں سکتا (۶/۱۲۲)۔ اِس آیۂ کریمہ کی حکمت کو سمجھنا اُس وقت ممکن ہے جبکہ کوئی ہوشمند موت اور زندگی کو سمجھ سکتا ہو، چنانچہ یہ عام ظاہری زندگی ایک طرح کی موت ہے، لہٰذا مومن کو رُوحانی جنم لینا چاہیئے، تاکہ وہ عالمِ شخصی میں آنکھ کھولے اور روشنی کو دیکھے، پھر

اسے جیتے جی ذائقۂ الموت کا تجربہ کرنا ہوگا، اور آخر کار اس کا انبعاث بھی ہوگیا تو تب وہ بحقیقت زندہ کہلائے گا، اسی طرح قرآنِ پاک میں دو موت اور دو حیات کا ذکر ہے (۴۰/۱۱)۔

۱۴۔ خدا، رسولؐ اور امامؑ کے بعد نور کا رشتہ مومنین سے جڑا ہوا ہے، مگر یہ راز امام کی معرفت میں پوشیدہ ہے کیونکہ امام زمانؑ تمام علمی اور عرفانی جواہر کا خزانہ ہے، انہی معنوں میں وہ نور کا بھی خزانہ ہے، جب مومن کو اس بات کا اقرار ہے تو سوچنا چاہیئے کہ کس طرح اس نور کا مشاہدہ ہو سکتا ہے، اور کس طریقے سے روشنی حاصل ہو سکتی ہے، اس کے لئے امامِ عالی مقامؑ کے مقدس ارشادات موجود ہیں، اور ان سے ہر قسم کی ہدایت ملتی رہتی ہے۔

اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا نور کو مومن کے پاس آنا چاہیئے یا مومن کو نور کے حضور جانا ہے؟ آیا خانۂ خدا حج کرانے کی غرض سے کسی دیندار کے پاس آسکتا ہے؟ کیا امام گھر گھر جاکر سب کو دیدار دے سکتا ہے؟ یاد رہے کہ ہر ناممکن چیز روحانیت میں ممکن ہو جاتی ہے، پس نور ہی ہے جس سے تمام اسرارِ معرفت پر روشنی پڑتی ہے، اور نور ہی ازل و ابد کے بھیدوں تک چلنے چلانے کے معنی میں ہے، چنانچہ قرآن میں جہاں نور کا ذکر آتا ہے، وہاں بہت سی حکمتیں جمع ہو جاتی ہیں، جیسے قرآنِ مقدس کا ارشاد ہے: اور جو لوگ خدا اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں (جیسا

کہ ایمان لانے کا حق ہے) یہی لوگ اپنے پروردگار کے نزدیک صدیقوں اور شہیدوں کے درجے میں ہیں ان کے لئے ان کا اپنا اجر اور نور ہے (۵۷/۱۹) اِس پر حکمت سماوی تعلیم میں اللہ اور اس کے پیغمبروں پر ظاہراً و باطناً کامل ایمان لانے اور معرفت کی روشنی میں تصدیق کرنے کا ذکر ہے، نیز شہید و شہادت کے معنی میں دو دفعہ راہِ خدا میں قربان ہو جانے اور دو دفعہ زندہ ہو جانے کے علاوہ مشاہدات کا تذکرہ بھی ہے، اور گواہی کا اشارہ بھی، اور اجر کے بعد یعنی سب سے آخر میں لفظ نور مذکور ہے، اِس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ نور کا درجۂ کمال یہ سب کچھ کرنے کے بعد آتا ہے، اور پھر اسی نور کی روشنی میں یہ سب سے بڑا بھید کھل جاتا ہے کہ نورِ خدا، نورِ پیغمبرؐ، نورِ امامؑ اور نورِ مومنین کے درمیان رشتۂ ازل و ابد کیا ہے، اور "نورُھم" میں یہ اشارہ موجود ہے کہ اِس اعلیٰ مقام پر مومنین کو بطورِ انا نے علوی امام مل جاتا ہے اور امامِ اقدس و اطہرؑ کے نور میں سب کچھ حاصل ہو جاتا ہے۔

۱۵۔ انفرادی قیامت (یعنی مقامِ روحانیت) میں مومنین و مومنات کا نور ان کے آگے اور داہنی طرف دوڑتا ہے (۵۷/۱۲) نور کو کیوں دوڑنا چاہیئے؟ کیونکہ یہ عملی مثال ہے اور اس میں بہت سے ادوار کا احاطہ کرنا ہے، یہ عقلی، علمی اور روحانی سفر ہے، اور ان کو دیکھ کر منافق مرد اور منافق عورتیں کہیں گے کہ ذرا ٹھہرو ہم بھی تمہارے نور سے چنگاری لیں (اور اپنے اندر اسے ایک کامل نور بنائیں) تو کہا جائے گا کہ تم اپنے پیچھے (سلسلۂ ماضی میں) لوٹ جاؤ اور (وہیں) ایک نور کی تلاش

کرو (۵۷/۱۳) اگر یہ واقعہ جسمانی طور پر سب کے مرجانے کے بعد پیش آتا تو قرآنِ حکیم کی ترجمانی میں نہ فرمایا جاتا کہ تم دُنیا میں لوٹ جاؤ، کیونکہ قرآن کے ظاہر میں اس کی نفی کی گئی ہے، بلکہ یہ ذاتی قیامت ہے، جس میں اجتماعی قیامت کی نمائندگی ہوتی ہے، یعنی یہ سب کچھ عالمِ مثال میں پیش آتا ہے، اور وہاں یہ کہنا درست ہے کہ نور جس کو ملتا ہے، اس کو زمانۂ آدمؑ سے ملتا ہے اور زمانۂ خاتم انبیاءؑ سے ملتا ہے، پس جاننا چاہیئے کہ آیاتِ نور میں سے ہر ایک آیت اپنے خاص مطلب کا ایک موضوع ہے، اور اس نوعیت کی باقی آیتیں اس میں شامل ہو جاتی ہیں، مثال کے طور پر اگر ہم "نورِ مومنین و مومنات" کو لیں، جیسا کہ مذکورہ آیت میں یہی موضوع ہے، تو تمام آیاتِ نور اپنی اپنی حکمتوں کے مطابق اس پر روشنی ڈالنے لگتی ہیں، اور اسی طرح قرآن میں ہر چیز کا بیان فرمایا گیا ہے۔

۱۶۔ سورۂ حدید (۵۷/۹، ۵۷/۱۲، ۵۷/۱۳، ۵۷/۱۹، ۵۷/۲۸) میں جس شانِ رحمت سے نور کا ذکر فرمایا گیا ہے اس سے ہر مومن کو پختہ یقین ہو سکتا ہے کہ یہ مقدس نور امامِ زمان صلوات اللہ علیہ ہے، جو مومنین و مومنات کی روحِ علوی ہے، جیسے مذکورہ سورہ کے علاوہ سورۂ تحریم (۶۶/۸) میں بھی واضح طور پر نور اور اہلِ ایمان کا ازلی و ابدی رشتہ بطریقِ حکمت بیان فرمایا گیا ہے، خدائے پاک کا وہ فرمان ملاحظہ ہو: یوم لا یخزی اللہُ النبیَّ والذین اٰمنوا معہ، نورھم یسعیٰ بینَ ایدیھم وبایمانِھم یقولونَ ربّنا اَتمِم لنا نورَنا واغفرلنا ج انّک

علیٰ کُلِّ شیءٍ قدیر (۶۶/۸) اس دن جب خُدا رسُولؐ کو اور ان لوگوں کو جو اُن کے ساتھ ایمان لائے ہیں رُسوا نہیں کرے گا (بلکہ) ان کا نُور ان کے آگے اور داہنی طرف چل رہا ہوگا اور یہ لوگ یہ دُعا کرتے ہوں گے پروردگارا ہمارے لئے ہمارا نُور پُورا کر اور ہمیں بخشدے بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے (۶۶/۸)۔

اِس نُورانی تعلیم میں رسُولِ پاکؐ، ائمہ طاہرینؑ اور مومنینِ بالیقین کا ایک ساتھ ذکر ہے، چُنانچہ زمانۂ نبوّت سے اِس طرف عالمِ شخصی کی ہر انفرادی قیامت میں یہ واقعہ ہوتے آیا ہے، کیونکہ انفرادی اور اجتماعی اعتبار سے نُور کا اتمام یعنی خُدا کا اپنے نُور کو پُورا کر دینا اسی دُنیا میں ہے (۹/۳۲، ۶۱/۸) اور نُورِ علم و عمل کے ظاہری و باطنی کارناموں سے درجۂ کمال پر پہنچ جاتا ہے۔

آیا یہ ممکن ہے کہ اللہ کا نُور دُوسرا ہو اور پیغمبرؐ کا نُور اس سے الگ ہو، یہ بات محال ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نُور کی تاویل رسُولِ اکرمؐ اور امامِ برحقؑ کا نُور ہے اور یہی نُورِ مومنین کا بھی ہے، بلکہ کچھ آگے چل کر دیکھا جائے تو ساری انسانیت کے لئے خُدا کی رحمت میں جگہ ہے، جیسے سورۂ رحمان (۲۶-۲۷/۵۵) میں اِس قانونِ فناو رحمت کا ذکر ہے کہ سب لوگ چہرۂ خُدا میں فنا ہو جانے والے ہیں، مگر یاد رہے کہ یہ فنا دو طرح سے ہے، ایک شعوری طور پر یعنی معرفت کی روشنی میں، اور دُوسری غیر شعوری حالت میں۔

نُور کی ایک خاص مثال آگ ہے، چُنانچہ جن چیزوں کو آگ فنا کر

ڈالتی ہے، وہ دو قسم کی ہوتی ہیں، ایک قسم وہ ہے جس میں ایسی چیزیں ہیں کہ ان کے جلنے سے روشنی، حرارت، طاقت، خوشبو وغیرہ بنتی ہے، اور دوسری قسم کی چیزیں وہ ہیں، جو جل کر فنا تو ہو جاتی ہیں، مگر اُن سے کوئی مفید کام نہیں بنتا، اِس مثال میں بہت بڑی کمی یہ ہے کہ آگ اور اس میں جلنے والی چیزیں محدود وقت میں ختم ہو جاتی ہیں، لیکن نُور اور اس میں فنا ہو جانے والے لوگ شعوری اور غیر شعوری طور پر ہمیشہ باقی رہتے ہیں، خُداوندِ عالم سب کو اپنے نُورِ پاک کی شناخت کے لئے توفیق عنایت فرمائے! اور قانونِ شفاعت تمام اِنسانوں کے لئے از بس مُفید ثابت ہو!

خاکپائے جماعت

نصیر الدین نصیر ہونزائی

لندن: ۲۹ر جولائی ۱۹۸۴ء

ایک عظیم علمی تحفہ

میں خانۂ حکمت اور ادارۂ عارف کی جانب سے یہ تحفۂ علمی بصد خلوص و خوشی جناب پریذیڈنٹ امین کوٹاڈیا اور ان کی بیگم محترمہ سیکریٹری مریم کوٹاڈیا کی خدمت میں پیش کرتا ہوں، جن کی کریمانہ سرپرستی میں ادارۂ عارف کی شاخ لندن سرسبز و شاداب ہے، چراغِ امامت کے ان دونوں جان نثار پروانوں کی علم دوستی اور گوناگون خدمات کی جتنی بھی تعریف و توصیف کی جائے کم ہے، لہٰذا ان کی بیمثال قربانیوں کے حقیقی اجر و صلہ کے لئے ہم سب علمی تشکر دعا کریں گے کہ کائناتی خزانوں کا مالک انہیں دین و دنیا کی صلاح و فلاح عنایت کرے! اور تاجِ معرفت سے سرفراز فرمائے! آمین یارب العٰلمین!!

۱۔ سورۂ نباء (۷۸/۳۸) میں خدائے پاک کا ارشاد ہے: جس دن رُوح اور فرشتے قطار باندھ کر کھڑے ہوں گے (اس دن) کوئی بات نہ کر سکے گا مگر جسے خدا اجازت دے (اور جس کو اجازت ہو) وہ

درست بات کرے گا (۷۸/۳۸)، تاویل: اِس آیۂ مقدسہ میں مقامِ عقل کا ذکر ہے جو مقامِ وحدت ہے، جہاں قطار باندھنے سے مُراد ایک ہو جانا ہے، یعنی یہ پیکرِ نُورانی کا ظہور ہے، جس میں سب جمع ہو جاتے ہیں، سو اُسی پاک و پاکیزہ صُورت میں جو بھی ہو صرف ایک بولے گا، اور اس کی بات حقیقت ہو گی۔

۲۔ سورۂ فجر (۸۹/۲۲) میں فرمایا گیا ہے: اور تمہارا پروردگار اور فرشتے قطار باندھ کر آجائیں گے جیسا کہ قطار باندھنا چاہئے (۸۹/۲۲)
تاویل: ایک جگہ سے دُوسری جگہ آنا جسم کا فعل ہے، مگر ذاتِ سُبحان جسم سے پاک و برتر ہے، لہٰذا یہ آیت متشابہات میں سے ہے جس کی تاویلی حکمت یہ ہے کہ قائمِ قیامت اور عظیم فرشتے قطار کی قطار عالمِ دین میں آئیں گے، اور ان کا قطار باندھنا یہ ہے کہ سب کے لئے صرف ایک ہی مُشترکہ شخصیت ہو گی۔

۳۔ قُرآنِ حکیم میں جہاں کہیں بھی "صف" کا ذکر ہو، تو اس کا مطلب مقامِ اعلیٰ پر صرف ایک شخص ہو گا، جیسے ارشاد ہے: خُدا تو اُن لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس کی راہ میں اس طرح صف باندھ کے لڑتے ہیں کہ گویا وہ سیسہ پلائی ہُوئی دیوار ہیں (۶۱/۴) یعنی مومنین شخصِ واحد میں ایک ہیں اور وہ وحدت مضبُوطی کی یہ صفت رکھتے ہیں، اور رُوحانی جہاد کرتے ہیں۔

۴۔ مذکورہ بیان قُرآنی حکمت کے مطابق قطار باندھنے

کے بارے میں تھا، اب یہ بھی دیکھ لیں کہ خُدا وند تعالیٰ کا شمار کرنا کس طرح ہوتا ہے، چُنانچہ ارشاد ہے: لقد احصٰھم وعدّھم عدّاً (۱۹/۹۴) اس نے یقیناً اُن سب کا اِحاطہ کر لیا ہے اور ان کو گن لیا ہے جیسا کہ گننا چاہیئے (۱۹/۹۴) یعنی اُس نے ان کو قانونِ وحدت کے مطابق گھیر کر اور گن کر ایک کر لیا ہے۔

۵۔ سورۂ جن کے آخر (۷۲/۲۸) میں ارشاد ہُوا ہے: واحاط بمالدیھم واحصٰی کُلّ شیءٍ عددا (۷۲/۲۸) اور اُس نے پیغمبروں کے عِلم کو احاطہ کر لیا ہے اور تمام چیزوں کو عددِ (واحد) میں گھیر لیا ہے یعنی رسُولوں کی رُوحانیت بھی جُملہ اشیاء کے ساتھ امامِ مُبین میں گھیری ہُوئی ہے، اور عددِ واحد سے امامِ زمان صلوات اللہ کی ذاتِ اقدس مُراد ہے، یاد رہے کہ خُدا جب چیزوں کا احاطہ کرتا ہے تو ان کی مرکزیّت ہو جاتی ہے، اور جس وقت ان کو گن لیتا ہے تو ان کی وحدت بن جاتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کے قول و فعل کے معنی انتہا کی طرف جاتے ہیں۔

۶۔ سورۂ انعام (۶/۱۱۵) وتمّت کلمت ربّک صدقاً وّعدلاً لا مُبدّل لکلمٰتہٖ (۶/۱۱۵) تیرے پروردگار کا کلمہ (یعنی کلمۂ باری) صدق و عدل میں پُورا ہے، کوئی اس کے کلمات کا بدلنے والا نہیں۔ یعنی صدق اور عدل کا سرچشمہ کلمۂ باری ہے، اللہ تعالیٰ کے کلماتِ تامّات بے بدل اور اٹل ہیں، وہ عِلم و حِکمت کے خزانے ہیں۔

۷۔ قرآنِ حکیم میں الٓمٓ (ا ل م) کے حروفِ مقطعات چھ سورتوں (۲/۱، ۲۹/۳، ۳۰/۳، ۳۱/۳، ۳۲/۳) کے آغاز میں آئے ہیں، اور الٓرٰ (ا ل ر) کے حروف پانچ سورتوں (۱۰/۱، ۱۱/۱، ۱۲/۱، ۱۴/۱، ۱۵/۱) کے شروع میں مذکور ہیں؛ ان دونوں شکلوں کی ایک خاص تاویل یہ ہے :-

الف : قسم ہے اوّل (یعنی قلم) کی، لام : اور قسم ہے لوح کی، میم/را : اور قسم ہے مرقوم/رقیم کی، یعنی عقلِ کُلّی، نفسِ کُلّی، اور کلمۂ کُن، جو آیاتِ کبریٰ بھی ہیں اور الکتاب بھی۔

۸۔ پیکرِ نور میں بہشت کے سارے باغ یکجا کئے گئے ہیں؛ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے : وَجَنّٰتٍ اَلْفَافًا (۷۸/۱۶) اور گنجان باغات (پیدا کردیں) نیز فرمانِ خُدا وندی ہے : وَحَدَآئِقَ غُلْبًا (۸۰/۳۰) اور گھنے گھنے باغ۔ کیونکہ تمام عقلی اور عرفانی میوے اِسی مقام پر یکجا حاصل ہوجاتے ہیں، جیسے سورۂ دہر (۷۶/۱۴) میں فرمایا گیا ہے : اور بہشت کے درختوں کے سائے ان کے نزدیک ہوں گے اور ان کے میوے ہر طرح سے تابعِ فرمان ہوں گے (۷۶/۱۴) یعنی اہلِ بہشت کا کسی نعمت کو چاہنا حکم کی طرح ہوگا، چنانچہ وہ جب کسی چیز کو چاہیں گے تو وہ چشمِ زدن میں ظاہر ہوجائے گی۔

۹۔ اِس آیۂ کریمہ میں بحقیقت نفسانی موت کا ذکر ہے، جس کا تجربہ جیتے جی ہوجانا چاہیئے، وہ ارشاد یہ ہے : کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ (۲۹/۵۷) ہر نفس موت کا مزہ چکھنے والا

ہے پھر تم ہماری طرف لوٹائے جاؤ گے۔ اِس سماوی حکمت کی تعلیم میں خصوصاً اس معجزاتی موت کا تذکرہ ہے جو رُوحانی جنم کے کچھ عرصہ بعد آسکتی ہے، جو عجائب و غرائب سے مملو ہے، جس کا نتیجہ خُدا سے رجُوع ہے۔

۱۰۔ اللہ تعالیٰ کا حکمت آگیں ارشاد ہے: سَنُرِیھِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَھُمْ اَنَّہُ الْحَقُّ (۴۱/۵۳)

ہم عنقریب ہی اپنی نشانیاں (معجزات) اطرافِ (عالم) میں اور خود ان میں بھی دکھا دیں گے یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ وہی یقیناً حق ہے۔ اِس آسمانی پیش گوئی میں جو زمانۂ نبوّت میں فرمائی گئی تھی پہلے تو موجودہ سائنسی عجائب و غرائب کی نشاندہی کی گئی ہے، اور اس کے بعد دَورِ رُوحانیت کا ذکر ہے، اور ان دونوں قسم کے معجزات کا مقصد ظاہر ہے کہ ان کی روشنی میں رُوح کو جیسا کہ چاہیئے پہچان لینا ہے تاکہ نتیجے کے طور پر ربّ کی معرفت حاصل ہو، جبکہ یہ روشنی حقّ الیقین تک پہنچ جاتی ہے۔

۱۱۔ ساق (پنڈلی) کی تاویل عقل ہے، جیسے اللہ پاک کا فرمان ہے: جس دن پنڈلی کھول دی جائے گی اور (کافر) لوگ سجدے کے لئے بُلائے جائیں گے تو (سجدہ) نہ کر سکیں گے (۶۸/۴۲) یعنی جہاں اور جب نُورِ عقل کا ظہُور ہوگا، اور مُنکر لوگوں کو اطاعت کی دعوت دی جائے گی، تو اُس وقت وہ اطاعت نہ کر سکیں گے۔ ساق کا دُوسرا ذکر ملکۂ سبا کے بارے میں ہے، چُنانچہ ارشاد ہے: اِس سے کہا گیا کہ آپ اَب محل میں چلئے تو جب اُس نے محل کو دیکھا تو اس کو گہرا پانی سمجھی اور اپنی

دونوں پنڈلیاں کھولدیں (۲۷/۴۴) یعنی جب اُس نے نورِ عقل کو دیکھا تو اپنی عقلِ جزوی کے ظاہری اور باطنی پہلو سے اس کو یکبارگی سمجھنے کی تیاری کی، اور دفعتہً اُس کی گہرائی سے عبور کرنے کا اندازہ کیا، مگر اس کا یہ گمان غلط تھا۔

ساق کا تیسرا ذکر سورۂ قیامت (۲۹-۳۰/۷۵) میں ہے، جس میں نفسانی موت کا ذکر ہے، اور وہ یہ ہے: اور پنڈلی سے پنڈلی لپٹ جائے گی اُس دن تجھ کو اپنے پروردگار کی طرف چلنا ہے (۲۹-۳۰/۷۵) اس میں بطورِ تنزیل جسمانی موت کا ذکر ہے، مگر تاویلاً رُوحانی موت کا تذکرہ ہے، جس میں ظاہری عقل باطنی عقل سے لپٹ جاتی ہے۔

۱۲۔ حضرت سلیمان علیہ السّلام امام مستودع تھے، آپؑ کے قصّہ قرآن میں عظیم رُوحوں کی رُوحانی سلطنت کی مثال موجود ہے، ملکۂ بلقیس حُجتانِ شب کی نمائندگی کرتی ہے، کیونکہ یہ ایک بہت بڑا راز ہے کہ ہادیٔ برحق علیہ السّلام لیلی و نہاری (یعنی دن رات کے) حُجّتوں کے توسّط سے دُنیا بھر کے لوگوں کو اپنی ذات سے وابستہ رکھتے ہیں، اور اِس قانون میں بہت سی حکمتیں پوشیدہ ہیں۔

۱۳۔ خُداوند تعالیٰ ہر پیغمبر اور ہر امام کو وہی رُوحانی سلطنت عطا کر دیتا ہے، جو اُس نے حضرت سلیمانؑ کو عطا کر دیا تھا، چنانچہ یہ انتہائی عظیم شئے شروع ہی سے اِس طرف وراثت کے طور پر چلی آئی ہے، جیساکہ ارشاد ہے: وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُدَ (۲۷/۱۶) اور سلیمانؑ داؤدؑ کے وارث ہوئے۔ اِس حکیمانہ اِشارت سے عقل و دانش کے سامنے یہ حقیقت روشن

ہو جاتی ہے، کہ حضرت سلیمانؑ کی یہ رُوحانی بادشاہی پہلے ان کے باپ حضرت داؤدؑ کے پاس تھی، اِس سے شاید یہ سوال پیدا ہوگا کہ اگر ایسا ہوتا تو قرآن پاک میں اس کا ذکر ہوتا، میں بڑی عاجزی سے عرض کروں گا کہ قرآنِ حکیم میں بزبانِ حکمت ہر چیز کا بیان موجود ہے، اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی اِس پاک کتاب کا نام قرآنِ حکیم رکھا گیا ہے۔

۱۴۔ قرآنی حکمت کا ایک خاص نام "حکمتِ بالغہ" ہے (۵۴/۵) کیونکہ اِس بے مثال و بے نظیر سماوی کتاب کی ہر مثال، ہر بات، ہر اشارہ اور ہر حکمت ہدایتِ حقّہ کی روشنی سے بھرپور ہونے کی وجہ سے مرتبۂ اعلیٰ تک رہنمائی کرتی ہے، اور بڑی خوبی سے نورِ عرش تک اس کی معنوی رسائی کی سیڑھی بنائی گئی ہے، اِسی طرح قرآنِ حکیم میں نہ صرف ہر چیز کا بیان ہے، بلکہ یہ سمجھنے والوں کے لئے آسان بھی ہے، جیسے اللہ تبارک تعالیٰ نے سورۂ قمر (۵۴) میں قرآن کے "نظریۂ آسانی" کی طرف بار بار توجہ دلائی ہے، اور وہ مبارک ارشاد یہ ہے: ولقد یسّرنا القرآن للذکر فھل من مدّکر (۵۴/۱۷) اور ہم نے قرآن کو نصیحت (اور ذکر) کے لئے آسان کر دیا تو کوئی ہے جو نصیحت حاصل کرے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن ایک پہلو سے مشکل ہے اور دوسرے پہلو سے آسان کیا گیا ہے، اور یہ بھی معلوم ہے کہ خداوند تعالیٰ سب کے لئے آسانی چاہتا ہے (۲/۱۸۵) لہٰذا اُس مہربان نے قرآنِ حکیم کی حکمتوں اور بھیدوں پر روشنی ڈالنے کے لئے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم کو نُور بنایا (۵/۱۵ ، ۴۲/۵۲) اور دورِ امامت میں بحکمِ خُدا و رسُولؐ امامِ برحق علیہ السّلام نُورِ قرآن اور چراغِ ہدایت ہیں (۵۶/۲۸) پس سورۂ قمر میں قرآنِ پاک کے اِسی آسان پہلو کی طرف بار بار توجّہ دلائی گئی ہے۔

۱۵۔ زمان ہو یا مکان، جسم ہو یا جان غرض ہر چیز خُدا کے نزدیک ایک مقرّر مقدار میں ہے (۱۳/۸) اِس سے تصوّرِ آفرینش کی لا ابتدائی اور لا انتہائی حیثیت ختم یا متأثر نہیں ہوتی، بلکہ اُس کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ خُدائے حکیم اپنے قانونِ قُدرت و فطرت کے مطابق ہر چیز کو اس کی حد سے پیدا کرتا ہے، مثال کے طور پر دن رات کا وقت ایک محدُود مقدار ہے، مگر اللہ اسے بصُورتِ دائرہ گھما گھما کر ماہ و سال اور غیر محدُود زمانے کو پیدا کرتا ہے، اِسی طرح اگرچہ ہر چیز ایک مقدّر مقدار اور ایک محدُود دائرے میں ہے، لیکن چیزوں کی بقا و فنا کی تکرار و گردش کی کوئی ابتدا و انتہا نہیں، اور یہ حقیقت قدرِ آنی حکمت کی روشنی میں ہے (۲۱/۳۶ ، ۳۶/۴۰)۔

۱۶۔ ایک آدمی میں کم و بیش اِتنی رُوحیں ہوتی ہیں جتنے کہ سیّارۂ زمین پر لوگ بستے ہیں، یقیناً یہی وجہ تھی جو قرآن حکیم نے فرمایا کہ جس شخص نے کِسی اِنسان کو ناحق قتل کیا تو اس نے گویا سب لوگوں کو قتل کیا، اور جس نے ایک آدمی کو زندہ کیا تو اُس نے گویا تمام لوگوں کو زندہ کر دیا (۵/۳۲) اس کی حکمت یہ ہے کہ ہر انسان بحدِّ قوّت ایک عالمِ شخصی ہے، اور اس میں بحدِّ قوّت دُنیا بھر کے لوگ رہتے ہیں، پس اگر کوئی ہدایت یافتہ شخص باذنِ خُدا کِسی فردِ بشر کو ایمان اور حقیقی حیات کے معنی میں زندہ کر دیتا

ہے، تو وہ اُس کے عالمِ شخصی میں گویا سب لوگوں کو زندہ کرتا ہے، اور ایسا باکرامت شخص صرف امامِ زمان علیہ السّلام ہی ہے، کہ وہی اسی طرح مُردوں کو زندہ کر سکتا ہے۔

۱۷۔ ہر چیز کا سایہ یا عکس ہُوا کرتا ہے، اسی طرح نُور کا بھی سایہ ہوتا ہے، مگر سایۂ نُور کو عکس کہنا زیادہ صحیح ہے، کیونکہ یہ دُوسرے سایوں سے قطعاً مختلف اور منوّر و روشن ہوتا ہے، جیسے سُورج کا عکس آئینے میں چمکتا ہے، چُنانچہ خُدائے رحمان نے عرشِ اعلیٰ سے اپنے نُور کا ایک عکس تمام اِنسانی قلُوب پر ڈالا، جس کو سب لوگوں نے فطری یا غریزی عقل کے معنی میں قبول کر لیا، ساتھ ہی ساتھ خُدا کے حُکم سے آفتابِ ہدایت بھی طلُوع ہو گیا، تاکہ عقلِ جسمانی کے اِس عکس کی تربیت و ترقی اور مرتبت کا تعیّن ہو، پھر اللہ تعالیٰ نے ان سب عکسوں کو بڑی آسانی سے اپنے قبضۂ قُدرت میں لے لیا، اور اگر وہ چاہتا تو ان کو یہاں سے نہ اُٹھاتا، وہ ارشاد درجِ ذیل ہے :-

الم ترالیٰ ربّکَ کیف مدّ الظّلّ ولو شاءَ لجعلہٗ ساکناً ثمّ جعلنا الشمس علیہ دلیلاً ثمّ قبضنٰہُ اِلینا قبضاً یسیراً (۲۵/۴۵-۴۶) (اے رسُولؐ) کیا تُم نے اپنے پروردگار کی طرف نہیں دیکھا کہ اُس نے کیونکر سایہ کو پھیلا دیا اگر وہ چاہتا تو اسے ٹھہرا ہُوا کر دیتا پھر ہم نے آفتاب کو اس کا رہنما بنا دیا پھر ہم نے اُس کو ایک طرح سے اپنی مُٹھی میں بآسانی اُٹھا لیا۔ اِس بابرکت

ارشاد میں زبردست نورانی حکمتیں ہیں، اور تجلیوں سے مملو علمی دیدار بھی ہے۔

۱۸- ایک انتہائی عظیم حکمت جو ہم سب کو اچنبھے میں ڈال سکتی ہے یہ ہے کہ جب انسان دائرۂ روحانیت پر چلتے چلتے مقام ابد میں پہنچ جاتا ہے تو وہیں پہ ازل بھی ہوتی ہے، جس کی وجہ سے اس کے ابتداء اور ابداع کا عظیم معجزہ صرف ایک ہی ہوتا ہے، یعنی ابتداء اور ابداع ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

ولقد جئتمونا فرادیٰ کما خلقنٰکم اوّل مرّۃٍ و ترکتم ما خوّلنٰکم وراء ظھورکم (۶/۹۴) اور تم ہمارے پاس ایک ایک ہو کے آئے جس طرح ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا اور جو کچھ ہم نے تم کو دیا تھا وہ سب اپنے پس پشت چھوڑ آئے۔

خاکپائے مومنین

نصیر الدین نصیر ہونزائی

لندن : ۱۳ر اگست ۱۹۸۴ء

اِبداع اور اِنبعاث

عـ۱ : ابداع کے لغوی معنی ہیں ایجاد، اختراع، نئی چیز پیدا کرنا، بغیر سابقہ نمونہ کے کوئی شئے بنانا، اور اِنبعاث کا لفظی ترجمہ ہے بھیجا جانا، جگانا، جاگنا، اُٹھانا، اُٹھنا، سُرعت سے ظاہر ہونا، جلدی سے چلنا، دوبارہ زندہ کرنا، اور ان دونوں لفظوں کی تاویل اِنشاء اللہ تعالیٰ اِس مضمون میں بار بار آئے گی۔

عـ۲ : ابداع کے بارے میں خُداوندِ عالم کا ایک مُبارک فرمان یہ ہے : بدیع السّمٰوٰت والارض ط واذا قضیٰ امرًا فانّما یقول لہٗ کُن فیکون (۲/۱۱۷) وہی آسمانوں اور زمین کا موجد ہے، اور جب کوئی امر پُورا ہوتا ہے تو سوائے اس کے نہیں کہ اسے کُن (ہوجا) فرماتا ہے اور وہ ہوجاتا ہے۔ چونکہ بموجبِ حدیث "مَنْ عَرَفَ" حصُولِ معرفت کی اصل درسگاہ رُوحِ انسانی ہے، لہٰذا ہمیں جاننا چاہیئے کہ اِس آیۂ کریمہ میں جو کچھ ارشاد ہے، اس کا اوّلین تعلّق عالمِ شخصی سے ہے، چُنانچہ یہ بندۂ ناچیز جو خاکپائے مومنین سے بھی کمتر ہے انتہائی

عاجزی کے ساتھ خداوندِ قدوس کے حضور پُر نور سے توفیق و تائید طلب کرتا ہے، اور اسی کی مہربانی کی دستگیری و یاری کی اُمید پر اِس حکمت آگین آیت کی وضاحت کی جاتی ہے کہ: اللہ تبارک و تعالیٰ ہر پیغمبر اور ہر امام کے عالم شخصی کو مذکورہ آیۂ مقدسہ کے مطابق ابداع کرتا ہے، جیسا کہ ابداع کرنا چاہئے یعنی خدائے علیم و حکیم انسانِ کامل کی ذاتِ بابرکات میں ایک امری عالم کو پیدا کرتا ہے، جو خلقی عالم سے قطعاً مختلف ہوا کرتا ہے، اور اس کا ظہور اس طرح ہوتا ہے کہ پہلے پہل قانونِ فطرت کے مطابق اُس مبارک ہستی کی جسمانی تخلیق مکمل ہو جاتی ہے، پھر اس کے بعد خصوصی ذکر و عبادت، اور علم و عمل کے نتیجے میں اُس شخصِ کامل کا رُوحانی جنم ہوتا ہے جیسا کہ قرآنِ حکیم میں ہے کہ حضرت عیسےٰ علیہ السّلام نے تمام کامل انسان کی نمائندگی اور ترجمانی کرتے ہوئے کہا:-

اور سلامتی ہے مجھ پر جس دِن میں پیدا ہوا اور جس دِن مروں اور جس دِن اُٹھ کھڑا ہوں زندہ ہو کر (۱۹/۳۳) یعنی روشنی اور تائید حاصل ہے جبکہ میرا رُوحانی جنم ہوا، اور جب رُوحانی موت (ذاتی قیامت) آئے گی اس میں زیادہ عجائب و غرائب کا مشاہدہ ہوگا، اور جب اِنبعاث کا وقت آئے گا تو اس میں بدرجۂ اعلیٰ معجزات کی تائید حاصل ہوگی، اِس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ ہر نبی اور ہر ولی (امام) کے عالمِ شخصی یا عالمِ امری کا آغاز اُس دن ہوتا ہے جبکہ اُس شخصِ کامل کی رُوحانی پیدائش ہوتی ہے، اور جوں جوں علم و عمل سے امور پورے ہوتے جاتے ہیں، توں توں اُن پر کلمۂ کُن کا اِشارتی

اطلاق ہوتا رہتا ہے، یہاں تک کہ رُوحانی انقلاب (قیامت) کا باب کھُل جاتا ہے اور بڑی تیزی سے مراحلِ رُوحانیت طے ہوتے جاتے ہیں تا آنکہ ایک دن انبعاث کا ایک انتہائی عظیم معجزہ سامنے آتا ہے، چُنانچہ انسانِ کامل پر پانچ ادوار گزرتے ہیں :-

الف : جسمانی تکمیل کا دَور۔

ب : رُوحانی پیدائش کا دَور۔

ج : نفسانی موت یا قیامت۔

د : اِنبعاث کا وقت۔

اور دَورِ تمامیت، جیسے قرآنِ پاک میں نُور کے تمام و کامل ہونے کا ذکر فرمایا گیا ہے (۶۱/۸ ، ۹/۳۲ ، ۶۶/۸)۔

یاد رہے کہ نُور نہ صرف عالمِ شخصی میں رفتہ رفتہ مکمّل ہو جاتا ہے، بلکہ یہ عالمِ دین میں بھی بتدریج درجۂ کمال پر پہنچتا ہے، پس خُدا تعالیٰ کے بدیع السمٰوٰتِ والارض ہونے کی تاویل یہ ہے کہ اُس نے ہر کامل اِنسان کی ذاتِ بابرکات میں ایک عالمِ امر کو پیدا کیا ہے، جس کا ہر کام اور ہر چیز قانونِ کُن کے تحت ہے، اگرچہ کلمۂ کُن کا مکمّل ظہور مقامِ عقل پر ہوتا ہے۔

۳۔ : سورۂ نحل (۱۶/۸۱) میں ارشاد ہُوا ہے : اور خُدا ہی نے تمہارے لئے اپنی پیدا کی ہُوئی چیزوں کے سائے بنائے اِسی نے تمہارے واسطے پہاڑوں میں گھروندے بنائے اور اسی نے تمہارے لئے کُرتے بنائے جو تمہیں گرمی سے

محفوظ رکھیں اور کرتے جو تمہیں ہتھیاروں کی زد سے بچائیں یوں خدا اپنی نعمت تم پر پوری کرتا ہے تاکہ تم اپنی انا اس کے سپرد کرو (۱۶/۸۱)۔

اس فرمانِ خداوندی میں ربّانی رحمتوں کا ایک بے پایان خزانہ پوشیدہ ہے، وہ یہ ہے کہ خدا نے اپنی تمام مخلوقات کے تین تین سائے بنائے، یعنی عقلی، رُوحانی، اور جسمانی سائے، چنانچہ جب آپ مرتبتِ عقل کی بہشت کی معرفت حاصل کریں گے، تو معلوم ہو جائے گا کہ وہاں عقلی راحت کے لئے ہر شخص اور ہر چیز کا عقلی عکس بصورتِ علم و حکمت موجود ہے، اور اسی طرح در جنّۂ رُوحانیت میں ہر آدمی اور ہر شے کا سایۂ رُوحانی مختلف حیثیتوں میں کام کرتا ہے نیز جسمِ لطیف جو تیرا سایہ ہے ایک بہت بڑی نعمت ہے، اس کی معنوی گہرائی یہ ہے کہ ہر مومن اپنے شخصی عالم کی بہشت میں ارواح و عقول اور اجسامِ لطیف پر بادشاہ ہوا کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے سب انسانوں کے لئے کوہِ عقل میں گھروندے بنائے ہیں، کیونکہ رحمتِ ایزدی میں کوئی فرق و امتیاز نہیں، مگر ہاں تفاوت ہے اقرار و فرمان برداری اور شناخت کی وجہ سے، تاہم قانونِ رحمت رفتہ رفتہ اپنا کام کرے گا، جس کے نتیجے میں ساری انسانیت کچھ آگے چل کر ایک ہو جائے گی، پھر عقل و دانش اور علم و فن کی روشنی سے سیارۂ زمین منوّر ہونے لگے گا (۳۹/۶۹)۔

اب سدابیل (کرتوں) کی بات ہونی چاہئے کہ وہ کیا ہیں؟ یہ

سماوی کُرتے حضرت مُبدِع کے ابداعی معجزات ہیں، پہلے کُرتے میں ہر قسم کی ظاہری و باطنی گرمی (دوزخ) سے نجات ہے، اور دُوسرے میں ہر نوع کی جنگ سے مخلصی اور بچاؤ ہے، یہ کُرتے جو خیاطِ ازل کے تیار کردہ ہیں عقل و جان کی فضیلتوں سے کیونکر عاری ہو سکتے تھے، لہٰذا ایک لحاظ سے یہ کامل اِنسانوں کی طرح ہیں، اور دُوسرے لحاظ سے عظیم فرشتوں کی مثال پر ہیں، چُنانچہ قرآنِ حکیم میں کئی مثالوں میں ان کا ذکر فرمایا گیا ہے، بہرحال جو ربّانی معجزہ گرمی سے بچانے کے لئے مقدّر ہے، اس میں برق کا پہلو نمایاں ہے، (۱۳/۱۲، ۳۰/۲۴) بہ این وجہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہ ایک ایسی مکمّل ابداع ہے، جس کا تعلق رُوح سے ہوتا ہے، اور دینِ اسلام کا دُوسرا عظیم ابداعی معجزہ جو رُوحانی جہاد کی غرض سے ہے، اور جو دُنیا کی مُعاندانہ جنگ کا خاتمہ کرنے کے لئے ہے، اس کا تعلق فلکی جسم سے ہے، جو جسمِ لطیف کی آخری ابداع ہے۔

میرا یقین ہے کہ اُڑن طشتریاں (یو۔ ایف۔ اوز) بھی یہی کُرتے ہیں، جن میں بنی نوع اِنسان کے لئے خُدائی رحمت رکھی ہُوئی ہے، اس کا نہ صرف قُرآنی ثبوت موجُود ہے، بلکہ عقلی دلیل بھی مہیّا ہو سکتی ہے، اور قرآن کا ثبوت یہ ہے کہ جو چھوٹے بڑے معجزات آفاق (دُنیائے ظاہر) میں رُونما ہوتے ہیں، اُن جیسے معجزات انفس (عوالمِ شخصی) میں بھی وقوع پذیر ہوتے ہیں (۴۱/۵۳) اِس پر شاید کوئی عزیز یہ سوال کرے گا کہ اگر ایسا ہے تو پھر کیا آدمی کے باطن میں

کسی وقت سائنس کی پیداوار جیسی بہت سی چیزیں ہو سکتی ہیں؟ مثلاً ٹیلیفون، وائرلیس، دُوربین، ریڈیو، ریکارڈ، کیمرہ، فلم، ٹی وی وغیرہ؟ میں عرض کروں گا کہ ہاں سوال بالکل درست ہے، سب چیزیں ہو سکتی ہیں، مگر دونوں کی نوعیت اور مقصد میں فرق ہے، کہ وہ آلات جس طرح مادی ہیں اور حصولِ دُنیا کی غرض سے ہیں، اسی طرح یہ آلے رُوحانی اور دینی ہیں اور ان کا مقصد دین اور معرفت کا حاصل کرنا ہے، لہٰذا یہ رُوحانی آلے ریڈیو، فلم وغیرہ نہیں کہلائیں گے، بلکہ ان کا نام حواسِ باطن یا رُوحانیت وغیرہ ہوگا۔

اب اُڑن طشتریوں کے بارے میں عقلی طور پر یہ ثابت کر دینا ہے کہ کس طرح انسان انکو لباس کے طور پر استعمال کر سکے گا، اور کن معنوں میں اِس دُنیا کی جنگ، جہالت، بیماری، اور مُفلسی ختم ہو جائے گی، وہ یہ ہے کہ اِس انقلابی سائنس کے دَور میں ایسی حیرت انگیز اُڑن طشتریوں کا کثرت سے اِس طرف آنے کا آخر کار کوئی مُفید نتیجہ اور کوئی صالح مقصد ہے؟ سائنس کی ریسرچ (تحقیق) کا راستہ اگرچہ فی الحال عرفانی رُوح کا راستہ نہیں، لیکن اِس طریق پر عام رُوح سامنے آ رہی ہے، کیونکہ رُوح کے ادنیٰ اور اعلیٰ درجات مقدّر ہیں، چنانچہ جب درجۂ ادنیٰ میں انسان کو رُوح کے فوائد کا پتہ چلے گا تو وہ کم از کم دُنیاوی فائدہ اور شہرت کی خاطر رُوح کی دریافت میں آگے بڑھے گا، اِس مقام پر میں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ دراصل رُوح اور مادّہ کے درمیان کوئی

حدِ فاصل نہیں، کہ سائنس دان مادّہ کی ریسرچ کرتے کرتے اس کی آخری حد پر رُک جائیں، اور وہاں سے آگے نہ بڑھ سکیں، بلکہ مادّہ اور رُوح ایک شے اور ایک ہی ہستی ہے، مگر یہ بات اپنی جگہ دُرست ہے کہ یہ چیز جہاں مُردہ اور کثیف ہے تو اس کو جسم کہا گیا، اور جہاں زندہ اور لطیف ہے تو وہ رُوح کہلائی۔

اِس سلسلے میں دُوسری طرف سے یہ ممکن ہے کہ فلائنگ ساسرز (FLYING SAUCERS) آسمانی پروگرام کے مطابق انسانوں کی رہنمائی اور مدد کریں، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اقوامِ عالم کو ایک کر لینے کی خاطر کوئی اصلاحی اِنقلاب برپا کریں، بہرحال اِنسانیت کے لئے کوئی مایوسی نہیں، کہ وہ مخلوق دراصل طشتری نہیں، حضرت مُبدِع یعنی قائم القیامت کا ابداعی معجزہ ہے، اور اہلِ بہشت کے لئے ایسی ہی چیزیں مسخر کر دی جاتی ہیں، زمانۂ قدیم میں جنّت یا دُوسرے سیّارہ سے جو حضرات آدم کے نام سے یہاں آئے، وہ یہی ابداعی جسم میں آئے تھے، اور زمین کے مختلف حصّوں پر رہنے لگے، پھر رفتہ رفتہ لطیف سے کثیف ہو گئے۔

۴: سورۂ مومنون (۲۳/۱۲) میں ہے کہ خُدا نے اِنسان کو گیلی مٹی کے جوہر سے پیدا کیا (۲۳/۱۲)، یعنی رُوح کو پہلے پہل مومنین سے پیدا کیا کہ وہی گیلی مٹی ہیں، یہ رُوح ایک زندہ اور لطیف اِنسانی تصویر تھی، چونکہ دُنیا کی ہر چیز اللہ کے خزانوں سے آتی ہے (۱۵/۲۱)، لہٰذا ضروری ہے کہ رُوح بھی اُن خزانوں سے آئے، "خزائنِ خُدا" کے مضمون میں اِس کا ذکر ہو چکا ہے، کہ رُوح اُن بڑے

خزانوں سے ہو کر مومنین میں آجاتی ہے، اور یہاں سے عالمِ انسانیت میں پھیل جاتی ہے، پس ارشاد ہے: پھر ہم نے اِس کو ایک جگہ (یعنی عورت کے رحم) میں نُطفہ بنا کر رکھا، پھر ہم ہی نے نُطفہ کو جما ہُوا خُون بنایا، پھر ہم ہی نے منجمد خُون کو گوشت کا لوتھڑا بنایا، پھر ہم ہی نے لوتھڑے کی ہڈیاں بنائیں، پھر ہم ہی نے ہڈیوں پر گوشت چڑھایا، پھر ہم ہی نے اِس کو ایک دُوسری صُورت میں پیدا کیا، تو خُدا بڑا بابرکت ہے جو سب بنانے والوں سے بہتر ہے (۱۲-۱۴/۲۳) اِس حکیمانہ ارشاد میں بہت سی حکمتیں موجُود ہیں، مختصر یہ کہ یہاں خُدا نے اپنی صفتِ خالقیت کے بہترین اور بلند ترین ہونے کا ذکر فرمایا ہے، ظاہر ہے کہ یہ اشارہ بہترین مخلوق کی طرف ہے، اور وہ ابداعی مخلوق ہے، پس ہر شخص سے خواہ مومن ہو یا کافر بمعجزۂ ابداع تین چیزیں پیدا کی جاتی ہیں، ایک عقلی سایہ، ایک رُوحانی صُورت، اور ایک لطیف جسم، اِس معجزے کی خبر سوائے اہلِ معرفت کے اور کسی کو نہیں ہو سکتی ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ بہت سے لوگ بہشت کی نعمتوں کو نہیں پہچانتے ہیں۔

سورۂ رعد (۱۳/۱۲) میں ارشاد ہے:- (خُدا) وہی تو ہے جو تمہیں ڈرانے اور لالچ دلانے کے واسطے بجلی کی چمک دکھاتا ہے اور بوجھل بادلوں کو پیدا کرتا ہے۔ یہ وہی ابداعی معجزہ ہے جو روشنیوں کے ساتھ وقوع پذیر ہوتا ہے، جس کے ناموں میں سے ایک نام قصۂ سلیمانؑ میں "جنّات کا رئیس" ہے، اِس عظیم الشّان معجزے کی عظمت

ہیبت، اور جلال کی وجہ سے زبردست ڈر بھی لگتا ہے، اور اس کے عجائب و غرائب کے سبب سے بار بار دیکھنے اور اس میں فنا ہو جانے کا بہت بڑا اشتیاق بھی پیدا ہوتا ہے، اور بوجھل بادلوں سے نتائج علمی مُراد ہیں جو اِس مقام سے متعلق ہیں، برق کا مطلب نورِ عیان اور ابداعی سُرعت ہے، آپ سورۂ روم (۳۰/۲۴) میں بھی دیکھیں۔

۶ : جب حضرت مُبدِع کا دیدار ہوتا ہے تو نفسِ مُطمئنّہ سے فرمایا جاتا ہے کہ : اے اطمینان پانے والی جان! (اب) اپنے پروردگار کی طرف لوٹ جا (درحالیکہ) تو اُس سے خوش اور وہ تجھ سے راضی ہے، تو میرے (خاص) بندوں میں داخل ہو جا اور بہشت میں داخل ہو جا (۸۹/۲۷-۳۰)۔

آخری رجوع رُویت کی کیفیت میں ہوتا ہے، جس کا مقام انبعاث و ابداع ہے، یعنی وہ منزلِ آخرین، جہاں انبعاث کا نتیجہ ابداع کی صورت میں نکلتا ہے، اِس کی وجہ یہ ہے کہ سفرِ روحانیت ایک دائرے کی شکل میں ہے، لہٰذا اس کا انجام اصولاً آغاز سے جا ملتا ہے، چنانچہ جو اصل ابداع ہے، وہ انبعاث کا نتیجہ ہے۔

۷ : سورۂ حدید (۵۷/۲۵) میں ہے : ہم نے یقیناً اپنے پیغمبروں کو واضح و روشن معجزے دیکر بھیجا اور ان کے ساتھ ساتھ کتاب اور ترازو نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں، اور ہم ہی نے لوہے کو نازل کیا جس میں سخت لڑائی ہے اور لوگوں کے لئے فائدے ہیں

اور تاکہ خُدا دیکھ لے کہ خُدا اور اُس کے رسُولوں کی کون مدد کرتا ہے (درحالیکہ خُدا اور رسُولان اس کے) سامنے نہیں، بیشک خُدا بڑا زبردست غالب ہے (۵۷/۲۵)۔

اِس قرآنی ہدایت و تعلیم میں، جو حکمتوں سے بھرپُور ہے، کتاب سے مرتبۂ امامت مُراد ہے، یعنی امامؑ جو رُوحِ تنزیل ہے، اور ترازُو کی تاویل اساسؑ ہے، جس کی تاویل سے لوگوں کے درمیان یہ بُنیادی انصاف قائم ہوسکتا ہے، کہ جن آیاتِ متشابہات میں تدریجی ہدایت موجُود ہے، ان کا دروازہ بند نہ ہو، اور لوہے کی تاویل حضرت قائمؑ قیامت ہے، جو باطنی اور رُوحانی طور پر زبردست جہاد کرنے والا ہے، جس کے نتیجے میں سب لوگ ایک ہو جائیں گے، اور اِس بین الاقوامی وحدت و سالمیت سے لوگوں کو طرح طرح کے فائدے حاصل ہوتے رہیں گے، جو مومنین بحقیقت فرمانبردار ہوں، ان کی رُوح اس رُوحانی جہاد میں شامل ہوسکے گی، مُسلمین و مومنین کی طرف سے خُدا اور اس کے رسُولوں کی مدد اسی معنٰی میں ہوسکتی ہے۔

۴: کائنات کے پلٹنے کا ایک اشارہ یہ بھی ہے کہ عالمِ دین اور حدُود حضرتِ قائمؑ میں سمٹ جاتے ہیں، اور اس کے ساتھ یہ فرمانا کہ:۔ کما بَدَاْنَا اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِیْدُہٗ (۲۱/۱۰۴، جس طرح ہم نے مخلُوق کو پہلی بار پیدا کیا تھا اسی طرح اس کو دوبارہ پیدا کرتے ہیں) اِس معنٰی میں ہے کہ اِنبعاث کا نتیجہ ابداع کی صُورت میں نکلتا ہے اور قائمؑ کا آخری ظہور مُبدِع

کی مرتبت میں ہوتا ہے، پس اِسی طرح قائم قیامت میں عالمِ دین سمٹ جاتا ہے۔

دُوسری تاویل: نُعِیدُہٗ، ہم اِس کا اعادہ کرتے ہیں، یعنی بار بار کرتے ہیں، پس یہ (ابداع و اِنبعاث) ایک سِلسلہ ہے، مثال: انبیاء و ائمہ علیہم السّلام میں سے ہر ایک کا انبعاث اور ابداع ہوتی ہے، چونکہ یہ حضرات قانونِ فطرت کا نمونہ ہیں، لہٰذا یہ کہنا بالکل دُرست ہے کہ ابداع و انبعاث ہمیشہ جاری ہے، اب اِس مقام پر مذکورہ آیۂ مُبارکہ کا تاویلی مفہوم یہ ہوگا: جس طرح ہم نے سابقہ انسانِ کامل کا انبعاث و ابداع کیا تھا، اسی طرح اس کا اعادہ کرتے ہیں، یعنی اِس حُکم کا اطلاق جیسے حضرت آدمؑ پر ہوتا ہے، ویسے حضرت عیسٰےؑ پر بھی ہوتا ہے (۳/۵۹) حالانکہ بظاہر ایسا لگتا ہے، جیسے اِنسانیت آدمؑ سے شروع ہُوئی ہو۔

۹: اِنسان کی آخری نجات اور دائمی بقا اِس میں ہے کہ وہ پیکرۂ نُورِ خُدا میں فنا ہو جائے، یہ فنا دُنیاوی اور مادّی چیزوں کی فنا سے قطعاً مختلف، اِنتہائی نرالی، اور بڑی معجزاتی ہے، اِس لئے کہ وہ ایک اعلیٰ اور عظیم لِقاء (دیدار) اور اشاراتی علم و عرفان سے حاصِل آتی ہے، جیسے سورۂ دہر کے آغاز میں ارشاد فرمایا گیا ہے: هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا (۷۶/۱) کیا اِنسان پر دہر سے ایک ایسا وقت آچکا ہے کہ وہ (اس میں) کوئی چیز قابلِ ذکر نہ تھا۔ دہر سے وہ مرتبہ مُراد ہے، جس میں ابداع اور

قائم ایک ہے، "دہر سے ایک وقت" کے معنی ہیں انبعاث و ابداع کا وقت، جس میں انسان چہرۂ خدا کے دیدار سے فنا ہو جاتا ہے، لیکن وہ اپنے بارے میں کچھ بیان نہیں کر سکتا ہے کہ وہ کہاں ہے اور کیا ہے، کیونکہ اس انتہائی عظیم معجزہ کی تاویلی حکمتیں بتدریج آتی ہیں، اس مقام پر یہ حقیقت بھی یاد رہے کہ اشارۂ آیت کے مطابق انسان پر یہ انتہائی عظیم معجزہ پہلے بھی گزر چکا تھا۔

۱۰ : آلِ عمران کی دو حکمت آگین آیتوں (۷۶-۷۷) کا واضح اشارہ یہ ہے کہ خداوندِ مہربان قیامت کے دن متقین سے کلام کرے گا، اُن پر نظرِ رحمت ڈالے گا، اور ان کو پاک و پاکیزہ کرے گا، اور آپ قرآنِ حکیم کی روشنی میں جانتے ہیں کہ کلامِ الٰہی کا ایک بڑا درجہ وہ ہے جس میں خاموش دیدار ہوتا ہے (۴۲/۵۱) اور ایسا دیدار انبعاث و ابداع کے مقام پر حاصل ہوتا ہے۔

۱۱ : امامِ عالیمقام علیہ السلام جس معنی میں صراطِ مستقیم ہے، وہ اسی معنی میں جسمانیت اور روحانیت کے درمیان ایک انتہائی کشادہ اور مضبوط پل بھی ہے، پل کے دوسروں کی طرح امامِ زمانؑ کے بشری اور ملکی یا ناسوتی اور ملکوتی دو پہلو ہوتے ہیں، وہ اس پہلو سے بشر ہوتا ہے اور اُس پہلو سے فرشتہ، خداوندِ رحمان نے امامت کا یہ پل اس لئے بنایا ہے کہ لوگ اس پر چل کر فرشتہ بن جائیں، جیسا کہ سورۂ واقعہ (۵۶/۶۰-۶۱) میں ارشاد ہے: ہم نے تم لوگوں میں موت کو مقرر کر دیا ہے،

اور ہم اس سے عاجز نہیں ہیں کہ تمہاری مثالیں بدل ڈالیں اور تم لوگوں کو ایک ایسی صورت میں پیدا کریں جسے تم نہیں جانتے (۵۶-۶۱) یہاں نفسانی موت اور انبعاث و ابداع کی طرف اشارہ ہے، جس کے نتیجے میں آدمی امامت کے پُل پر چل کر فرشتہ بن جاتا ہے۔

۱۲: قرآنِ حکیم کی حکمت میں ملکۂ سبا حجتانِ لیلی کا حجاب ہے اور مریمؑ حجتانِ نہاری کا حجاب، دونوں مثالوں میں انبعاث و ابداع کا معجزہ اپنا کام کر رہا ہے، مگر اس میں بہت بڑا فرق یہ ہے کہ اُدھر بلقیس کی غیر شعوری حالت میں یہ واقعہ ہوا اور اِدھر مریمؑ کے سامنے عملی رُوحانیت و معرفت کی روشنی میں، چنانچہ رُوحِ خداوندی کے عنوان سے امامؑ کا نورانی ظہور ہوا، جس کو مریمؑ نے دیکھا، کیونکہ قانونِ خدا ایسا نہیں کہ جبرائیل یا اور کوئی فرشتہ پیغمبر اور امامؑ کے بغیر لوگوں کے پاس آیا کرے، اور خاص بات یہ ہے کہ امامِ عالیمقامؑ خدا کا امر ہے، اس معنی میں وہ صاحبِ امر ہے، یعنی ایسے معجزات امام کی ذاتِ اقدس سے متعلق ہیں، جو "کُن" سے واقع ہوتے ہیں، اور "کُن" امام ہے، جو خداوند تعالیٰ کا زندہ امر ہے۔

۱۳: قرآنِ پاک میں "امر" سب سے بڑا موضوع ہے، چنانچہ "ا م ر" کے مادّہ سے بنے ہوئے الفاظ جتنے بھی قرآن میں آئے ہیں، وہ سب براہِ راست اور بالواسطہ اسی مضمون سے وابستہ ہیں، اور یہ مضمون خود صاحبِ امر سے متعلق ہے، اس سے بڑھ کر یہ کہ خود قرآن خداوند عالم کا امرِ صامت ہے (۶۵/۸) اور امام اللہ تعالیٰ

کا امرِ ناطق ہے (۵۹/۴) اور دونوں معنوں میں صاحبِ امر امامِ عالیمقام علیہ السّلام ہے، کیونکہ جو بولتا امر ہوتا ہے وہ صاحبِ امر بھی ہوتا ہے، اور جو صاحبِ امر ہوتا ہے، وہ بذاتِ خود امر بھی ہوتا ہے۔

۱۴ : خُدا تعالیٰ کی خُدائی میں کلمۂ امر کی ابداعی قوّت انتہائی عظیم قوّت ہُوا کرتی ہے، اِس طاقت کا اصل سرچشمہ اللہ پاک کی کُرسی ہے، جو رُوح الارواح اور نفسِ کُلّی ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے، اور ان دونوں کی حفاظت اُس کو نہیں تھکا سکتی (۲/۲۵۵) انبیاء علیہم السّلام کے بڑے بڑے معجزات اسی قوّت سے رُونما ہُوئے، انفرادی قیامت اِسی ابداعی قوّت سے برپا ہو جاتی ہے، اور بہشت کی تمام نعمتیں اِسی سے مہیّا ہوتی رہتی ہیں۔

۱۵ : قولہ تعالیٰ : کُلُّ مَنْ علیھا فانٍ (۵۵/۲۶) وّیبقیٰ وجہ ربّکَ ذُوالجلالِ والاکرام (۵۵/۲۷) جو (مخلوق) زمین پر ہے سب فنا ہونے والی ہے اور صرف تمہارے پروردگار کا چہرہ جو صاحبِ جلالت و کرامت ہے باقی رہے گا۔ اِس کے بعد ارشاد ہے : فَبِاَیِّ اٰلآءِ رَبِّکُمَا تکذِّبانِ (۵۵/۲۸) تو تُم دونوں (یعنی گروہِ جنّ و انس) اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جُھٹلاؤ گے۔ یہاں پر یہ اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ ساری مخلوق کی یہ فنا کس نوعیّت کی ہے ؟ کیا یہ جسمانی فنا ہے یا رُوحانی ؟ یا دونوں ہیں ؟ کیا چہرۂ خُدا زُمرۂ خلائق میں آسکتا ہے ؟ نہیں تو اس کا ذکر یہاں "کُلُّ من علیھا" کے ساتھ آکر پھر مُستثنا کیسے ہُوا ؟ آیا یہ

فنا برائے فنا ہے یا برائے بقا؟ یہ سوالات اِس لئے ضروری ہوئے، تاکہ ہر ہوشمند مذکورہ ارشاد میں خوب سوچے، کیونکہ اس میں قانونِ فنا اور اس کے نتیجے کا ذکر ہے، چنانچہ ان کے جوابات یوں ہیں: اِس فنا میں ہر ہر قسم کی فنا شامل ہے مگر سب سے مُفید فنا وہی ہے جو صرف جیتے جی حاصل ہو سکتی ہے، کیونکہ یہ اِبعاث اور اِبداع کا نتیجہ ہے، خُدا کا چہرہ امامِ زمانؑ ہے، امامؑ کے ناسُوتی اور ملکوتی دو پہلو ہُوا کرتے ہیں، چنانچہ وہ ایک پہلو سے اِنسانوں کے ساتھ اور دُوسرے پہلو سے فرشتوں کے ساتھ، یہی سبب ہے کہ امامِ زمانؑ کو جو وجہ اللہ کا قائم مقام ہے جسم کے اعتبار سے مخلوق میں شمار کیا گیا ہے مگر نُور کے لحاظ سے غیر فانی قرار دیا گیا ہے، اور اِس حکیمانہ ارشاد کا اشارہ یہ ہے کہ اہلِ زمین میں سے بہت تھوڑے لوگ عِرفانی طور پر اور باقی سب غیر عِرفانی حالت میں فنا ہو کر امام کی ذاتِ عالی صفات میں جمع اور محدُود ہو جاتے ہیں، جیسے سورۃ یاسین (۳۶/۱۲) کا ارشاد ہے کہ خُدا نے سب چیزوں کو امامِ مُبین کی ذات میں گھیر رکھا ہے، تاہم سب لوگ امام میں ہوتے ہُوئے بھی فی الحال یکساں اور برابر نہیں ہو سکتے ہیں، جس طرح اِنسانی جسم میں بے شمار ذرّاتِ رُوح (خُلیّات CELLS) موجُود ہوتے ہیں، مگر احساس کے لحاظ سے یہ تمام ذرّات ایک جیسے نہیں ہو سکتے، کیونکہ ان میں سے جتنے ذرّات حواسِ ظاہر و باطن کے مراکز پر ہیں، وہ تو زیادہ حسّاس ہیں۔

ع ۱۶ : قرآنِ حکیم کسی شک اور اُلجھن کے بغیر بڑی صفائی کے ساتھ یہ تعلیم دیتا ہے کہ ہر چیز خُداوند تعالیٰ کے خزانوں سے آتی ہے (۱۵/۲۱) اب قرآنِ پاک میں رجوع جیسے الفاظ کی حکمت کو جاننا ضروری ہے، کہ اگر انسان خُداوند تعالیٰ کے کسی خزانے سے یہاں آیا ہے، تو کیا اس کو واپس اُسی خزانے میں نہیں جانا چاہیئے ؟ کیا آدمی کے اِس دُنیا میں آنے کی نسبت سے وہی خزانہ مُبداء اور لوٹ جانے کی وجہ سے وہی معاد نہیں ہوگا ؟ آیا اللہ تعالیٰ کے خزائن کے سوا کوئی اور جگہ ہو سکتی ہے جو بارگاہِ ایزدی اور اس کی "عندیت" کا درجہ رکھتی ہو، جبکہ ربّانی خزانوں میں قرب و عندیت کا مرتبہ بھی شامل ہے ؟ اس کا جواب ہے کہ ہاں، اِنسان کو لوٹ کر وہاں جانا چاہیئے، جہاں سے یہ اِس طرف آیا ہے، کیونکہ مُبداء اور معاد ایک ہی ہے، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ اور عندیت اُس کے خزائن سے الگ نہیں۔

ع ۱۷ : اِنسان کی ذات میں عالمِ خیال اور عالمِ خواب دو ایسی شہادتیں (گواہیاں) ہیں کہ ان کی مدد سے ہر شخص اِنبعاث و ابداع کی واقعیّت کو سمجھ سکتا ہے، اِس کی مثال یُوں ہے کہ ایک آدمی خیال ہی خیال میں چاند پر کیا ستارۂ مریخ پر جا کر واپس آ سکتا ہے، بغیر اس کے کہ اس جانے اور آنے میں کوئی وقت لگے، وہ آسمان زمین کی کوئی بھی چیز تصوّر میں لا سکتا ہے، کسی قصّے یا تذکرے کی روشنی میں ماضیٔ بعید میں جا پہنچتا ہے، مُستقبل کی طرف جا کر قیامت کا خیال کرتا ہے، وہ اگر چاہے تو

ہر اُس شخص کو جو کبھی دیکھا گیا تھا آئینۂ خیال میں دیکھ سکتا ہے، اور جس کو ابھی نہیں دیکھا ہو صرف اُس کے بارے میں سُنا ہو اس کی ایک خیالی شبیہہ بنا لیتا ہے، ان میں سے ہر کام معجزۂ کُن (ہو جا) کی طرح بڑی سُرعت سے انجام پاتا ہے، لیکن یہ چیزیں حدِّ قوّت میں ہیں، اور حدِّ فعل ابھی دُور ہے اِس لئے ان میں نورِ روحانیت نہیں، جب نور نہیں، تو سرور کیسے ملے، تاہم ان مثالوں کے ذریعے سے معجزۂ ابداع کو سمجھنا بیحد ضروری ہے، نیز اِس قانونِ فطرت کو جاننا ہے کہ خُدا کی بادشاہی میں ہر چیز پہلے تو حدِّ قوّت میں ہُوا کرتی ہے، پھر اس کے بعد حدِّ فعل میں آجاتی ہے، اِس کے معنی یہ ہُوئے کہ اِنسان بہشت میں ہر وہ کام کر سکے گا، جس کی وہ دُنیا میں خواہش رکھتا تھا، اور جس کے لئے خواب و خیال میں مشقیں کیا کرتا تھا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لھم مایشاءُ ون فیھا ولدینا مزید (۵۰/۳۵) اِس میں یہ لوگ جو چاہیں گے انکے لئے حاضر ہے اور ہمارے ہاں تو (اس سے بھی) زیادہ ہے۔ یاد رہے کہ قُرآنِ مُقدّس میں اِس نوعیّت کے بہت سے ارشادات مَوجُود ہیں۔

اِسی طرح عالمِ خواب کی ہر ہر چیز سے اِبتعاث و ابداع کی مثال مِلتی ہے، چُنانچہ اس میں خوشخبری بھی ہے اور انذار (ڈرانا) بھی، بہشت کا نمونہ بھی ہے اور دوزخ کی مثال بھی، روشنی بھی ہے اور تاریکی بھی، بلندیوں میں پرواز بھی ہے، اور پستیوں میں سقوط بھی، غرض

خواب ایک ایسی دُنیا ہے کہ اِس میں مُسرّت و شادمانی بھی ممکن ہے اور غم واندوہ بھی، سو یہ رُوحانی موت، قیامت، انبعاث اور ابداع کی طرح ہے، لہٰذا اپنے آپ سے سوال کرنا چاہیئے کہ آدمی کس طرح عالمِ خواب میں منتقل ہو جاتا ہے؟ کیا وہ وہاں اِس جسم کے ساتھ جاتا ہے یا اس کے بغیر؟ خواب کی دُنیا یکایک کہاں سے پیدا ہُوئی؟ جب آدمی بیدار ہو جاتا ہے تو اُس وقت عالمِ خواب کہاں جاتا ہے یا کدھر پوشیدہ ہو جاتا ہے؟ کیا یہ عالمِ شخصی کی طرح ہے؟ اگر بہشت میں نیند نہیں ہے تو کیا عالمِ خواب کا خاتمہ ہو جائے گا یا یہ اور عالمِ خیال دونوں شخصی عالم (PERSONAL WORLD) میں بدل جائیں گے؟ اِس قسم کے سوالات کر کے دُنیائے خواب کے بارے میں سوچنا ضروری ہے، کیونکہ خواب جسمانی موت اور رُوحانی موت (قیامت) کی ایک مثال ہے، جیسا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

خدا ہی لوگوں کے (رُوحانی اور جسمانی طور پر) مرنے کے وقت ان کی رُوحیں لیتا ہے اور جو لوگ نہیں مرے (ان کی رُوحیں) نیند میں اُٹھائی جاتی ہیں، پھر جن رُوحوں پر موت کا امر پورا ہو چکا ہو ان کو روک رکھتا ہے اور باقی (یعنی سونے والوں کی رُوحوں) کو پھر ایک مقرر وقت تک کے واسطے بھیج دیتا ہے، بیشک اِس میں غور و فکر کرنے والے لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں (۳۹/۴۲) اِس آسمانی تعلیم میں تین بڑی حکمتیں پوشیدہ ہیں :-

الف : سو کر عالمِ خواب سے جاگ اُٹھنا آخرت کو دیکھ کر دُنیا

میں واپس آنے کے مشابہ ہے۔

ب: روحانی طور پر مرنے والے انسانِ کامل کی روح ایک اعتبار سے آخرت میں پہنچی ہوئی ہوتی ہے۔

ج: دوسرے اعتبار سے یہ عظیم روح قیامت و آخرت کو دیکھ کر دنیا میں آئی ہوئی ہوتی ہے۔

۱۸: آخری بار فنا ہو جانے کے باوجود اہلِ بہشت کی اپنی اپنی انفرادیت کا قائم و باقی رہنا ضروری ہے، کیونکہ مصلحت و حکمت اسی میں ہے، تاہم فنا فی اللہ اور بقا باللہ کی وجہ سے بندۂ مومن کی خواہش خدا کی مشیت کے ساتھ ایک ہو جائے گی، جس کی بابت قرآنِ پاک میں کئی روشن دلیلیں موجود ہیں۔

۱- سورۂ دہر (۷۶/۳۰) اور سورۂ تکویر (۸۱/۲۹) میں دیکھئے کہ ربِ کریم کا خطاب ایمان کے مدارجِ اعلیٰ کی طرف ہے، اور فرمایا گیا ہے: اور تم کچھ چاہتے ہی نہیں مگر وہی جو اللہ چاہتا ہے (۷۶/۳۰، ۸۱/۲۹) یہ ان لوگوں کے بارے میں ہے جو ایمان کے درجۂ کمال پر ہیں۔

۲- خدا کی طرف سے اختیار دیا جاتا ہے، پھر وقت آنے پر واپس لیا جاتا ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ آخرکار خدا ہی کا ارادہ بندۂ مومن کا ارادہ بن جاتا ہے، ملاحظہ ہو سورۂ احزاب (۳۳/۳۶) جس کا ترجمہ یہ ہے: کسی مومن اور کسی مومنہ کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسولؐ کسی معاملے کا فیصلہ کر دے تو پھر اسے اپنے معاملے میں اختیار باقی رہے۔ یہاں یہ اشارہ ہے کہ مقامِ امر پر جب خدا و رسولؐ کے اختیار کا ظہور ہوتا ہے تو اس حال میں بندۂ مومن اس اختیار کو اپنا

ہے اور اپنے اختیار کو چھوڑ دیتا ہے۔

۳۔ ایمان کے درجۂ کمال پر اختیار کے بارِ گران سے سبکدوش ہو جانے کا نام توکّل ہے، دیکھئے سورۂ یونس (۱۰/۸۴) میں، جیسا کہ ارشاد ہے: اور موسیٰؑ نے کہا اے میری قوم اگر تم (حقیقی معنیٰ میں) خدا پر ایمان لا چکے تو اسی پر توکّل کرو (یعنی خدا کو اپنا وکیل بناؤ) اگر تم اپنی انا کو اس کے سپرد کرنے والے ہو (۱۰/۸۴)، پس معلوم ہوا کہ متقین کو جنت میں خدا تعالیٰ کی مشیت حاصل ہوگی، اور یہ مشیت انکے ذاتی عالم میں کلمۂ کُن کی طرح کام کرے گی۔

۱۹ : انبیائے قرآن علیہم السّلام نے قادرِ برحق کے اذن سے جو جو معجزات کر دکھائے، وہ سب کے سب ابداعی قوّت کی وجہ سے تھے، اگرچہ ابداع کا خاص تعلق عالمِ امر سے ہے، اور یہ وہاں ہمیشہ کے لئے کام کرتی ہے، تاہم بطورِ معجزہ اس کے فعل کا ظہور عالمِ خلق میں بھی ہو سکتا ہے، یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ عالمِ خلق اور عالمِ امر کے درمیان صرف ایک ہی دیوار ہے، اور یہ دیوار وہی ہے جو حواسِ ظاہر اور حواسِ باطن کے درمیان قائم کی گئی ہے، جسے تاویلی حکمت میں سدِّ ذوالقرنین کہا جاتا ہے، چنانچہ جب شخصِ کامل کی ذاتی قیامت برپا ہونے لگتی ہے، تو اُس وقت ذرّاتِ یاجوج و ماجوج اس دیوار کو جو رُوحِ حیوانی سے بنائی گئی ہے چاٹ چاٹ کر نہ ہونے کے برابر کر دیتے ہیں، جس کے نتیجے میں دونوں جہان ایک ہو جاتے ہیں، اور حواسِ ظاہر و باطن بھی ایک ہو جاتے ہیں، پس امام ایک ایسے کامل اور مکمّل شخص کا نام ہے، جو

انسانی عروج و ارتقاء کے لئے حضرت رسولؐ کے اُسوۂ حسنہ کا عملی نمونہ ہے، جس کی ذاتِ اقدس سے وہ دیوار اُٹھائی گئی ہے، جو عالمِ ظاہر اور عالمِ باطن کے درمیان حائل ہوتی ہے، اور ان تمام معنوں میں امامِ مبینؑ کی ذاتِ اقدس ہر چیز پر محیط ہے۔

خاکِ راہِ اہلِ ایمان

نصیر الدین نصیر ہونزائی

لندن: ۱۰ر اگست ۱۹۸۴ء

ISW
Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

اظہارِ قدر دانی و اِحسانمندی

بخدمت عالی جناب علّامہ نصیر الدین نصیر ہونزائی صاحب

عزّت و فضیلت مآب جناب علّامہ صاحب

آپ نے ہمارے اِس رُوحانی آسمان کو اپنے ساتھ لایا ہے، جو محبّت و شفقت کی موسلا دھار بارش برساتا ہے، آپ نے ہمیں ہادیٔ برحق مولانا حاضر امام ؑ کے گوہرِ معرفت کے بحرِ بے پایان اور اس کے اسرار کے گنج گرانمایہ سے متعارف کرایا ہے۔

صاحب! ہم نہیں جانتے ہیں کہ کس طرح آپ سے خطاب کیا جائے! آپ کا وسیع اور بے پایان علم بار بار ہمیں اسماعیلی تاریخ کے عظیم داعیوں کی یاد دلاتا ہے، ہماری تاریخ کی اُن جلیل القدر شخصیتوں کے کام اور کارناموں کے بارے میں اکثر ہمیں حیرت ہوتی تھی، لیکن آپ سے مُلاقات کے بعد ہمیں اِس حقیقت کا یقین آیا کہ اسماعیلی مذہب حقیقی معنوں میں ایک زندہ اور متحرک مذہب ہے، جس میں ایک حقیقی مومن کے لئے اِس بات کی گنجائش ہے کہ وہ عشق، عبادت، اور سعیٔ پیہم کے ذریعے

امامِ زمانؑ کے علم تک براہِ راست رسائی حاصل کر سکے، آپ کے علم کی وسعت اور آپ کا کامل و بالغ اندازِ تعلیم اسماعیلی مذہب کے عظیم معجزات کی ایک زندہ مثال ہے۔

صاحب! آپ نے عصرِ حاضر کی سائنسی ترقی کی روشنی میں ہمارے مذہب اور قرآنِ مقدس کی جس انداز میں صراحت فرمائی ہے، اس کے لئے ہم خصوصی طور پر آپ کے ممنونِ احسان ہیں، مثال کے طور پر آپ کے مقالے "کراماً کاتبین" سے اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے کہ کس طرح اسلام دینِ فطرت ہے، ہمارے قرآنِ پاک کی جو تاویلات آپ نے فرمائی ہیں اس سے ہم سراپا مجذوب و متحیر ہو گئے ہیں، آپ نے بمصداقِ فرمانِ حضرت مولانا سلطان محمد شاہ صلوات اللہ علیہ کہ: "قرآنِ پاک کے حسن و جمال کی یہ شان ہے کہ اس کا تصورِ حقیقت خود بخود اپنے آپ کو ایک طرف اعلیٰ ترین اور جدید ترین فکر کے ساتھ اور دوسری طرف نہایت ہی ابتدائی اور سادہ فکر کے ساتھ ساز گار کر لیتا ہے" صحیح معنوں میں دکھایا ہے کہ کس طرح ہر چیز قرآنِ مقدس میں سمائی ہوئی ہے۔

صاحب! بالخصوص ہم آپ کے اس احسان کی کبھی بھی کما حقہٗ شکر گزاری نہیں کر سکتے ہیں، جس میں آپ نے ہمیں یہ حقیقت دکھائی کہ ایک مومن کو اس دنیا میں ایک بامقصد زندگی گزارنے اور نورانی دیدار، وحدت، اور یک حقیقت کی غرض سے ہمہ وقت کام کرنے کے لئے اعتماد و ایمان عطا کرنے کی خاطر قرآنِ مجید کی ہر آیت سے نورِ امامت کس

طرح جلوہ نمائی کرتا ہے۔

صاحب! جس انداز میں آپ نے ازل و ابد و ابداع و انبعاث کے مشکل تصوّرات کو بیان فرمایا ہے، اِس سے آپ کے علم کی گہرائی اور رُوحانی تجربے کی شہادت ملتی ہے، اور ساتھ ہی ساتھ اِس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ آپ کا مقصدِ زندگی (MISSION IN LIFE) اسماعیلی مذہب کے حقیقی علم کو پھیلانا ہے، علاوہ ازیں صاحب! آپ جس طرح اپنی تعلیمات پر خود عمل کرتے ہیں، اس سے ان تمام حضرات پر جن کو آپ کے حلقۂ درس یا مجالسِ وعظ و نصیحت میں شرکت کرنے کی سعادت نصیب ہوئی ہے، ایک لازوال اثر باقی رہ جاتا ہے۔

آپ کا منطقی اور واضح انداز میں مشکل تصوّرات کا طریقِ ابلاغ، مخالفت کے مقابلے میں آپ کا صبر و تحمّل، شاگردوں کے لئے آپ کی محبّت و شفقت، اور آپ کی انتہائی فرد و تنی، یہ آپ کی وہ صفات ہیں، جو آئندہ دنوں میں آپ کی جسمانی دُوری کے وقت ہمیں تسلّی دیں گی۔

صاحب! آپ کے ساتھ گریہ وزاری کی مجالس میں شرکت ہم سب کے لئے ایک ناقابلِ فراموش تجربہ ہے، ان مجالس سے ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم دل کے اس زنگ و سختی سے پاک ہو گئے ہیں، جس کے ہونے سے عبادت میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے، ہمیں یقین ہوتا ہے کہ ہمارے آقا مولانا حاضر امام کے لئے پُرسوز محبت و طاقت ہے، جو سفرِ رُوحانیت کے دوران ہمیں اپنے نفسِ امّارہ کے نلوب

کرنے کے سلسلے میں پیش آنے والے ہر گونہ موانع و مزاحمات پر غالب آسکتی ہے۔

صاحب! آپ نے لنڈن کے گزشتہ دو دوروں کے دوران یعنی ہمارے درمیان آپ کی ذاتی حضوری کے وقت، اپنی کتابوں، مضامین اور خط و کتابت کے ذریعے امام زمان (صلوات اللہ علیہ) کی پاک و پاکیزہ تعلیمات اِس فیاّض اور بے دریغ انداز میں ہمیں عنایت فرمائی ہیں کہ اس کی شکر گزاری کے جو احساسات ہمارے دِل میں ہیں، ان کی کماحقہٗ، ترجمانی کچھ الفاظ نہیں کر سکتے۔ صاحب! آپ ہمارے لئے دُعا فرمائیے کہ جو علم آپ نے ہمیں عنایت فرمایا ہے، اس کو جماعت کے مفاد اور ترقی کی خاطر زیادہ سے زیادہ اور نہایت ہی موزوں اور وسیع پیمانے پر استعمال کر سکیں۔

یہاں پر آپ کے دورانِ اقامت جبکہ آپ باقاعدگی سے درس دیتے اور بلا توقف لکھتے رہتے ہیں ہم آپکے خاکسار شاگرد اتنا وقت اور توجہ نہ دے سکے ہیں، جتنا کہ ہم کو دینا چاہیئے تھا، اس کے لئے آپ ازراہِ کرم ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرمائیے، اور ہمیں اپنے علم سے مستفید فرمانے کے لئے اتنے دُور سے تشریف لانے میں جو زبردست زحمت آپ نے اُٹھائی ہے، اِس کے لئے ہماری مخلصانہ شکر گزاری قبول فرمائیے۔

آپ کے خاکسار شاگرد

لندن: ۱۱ر اگست ۱۹۸۴ء

Table of Contents

فہرست تصانیفِ علامہ نصیرالدین نصیر ہونزائی

نمبر شمار	اسمائے کتب	نظم / نثر
	اردو	
۱۔	آٹھ سوال کے جواب	نثر
۲۔	امام شناسی I	نثر
۳۔	امام شناسی II	نثر
۴۔	امام شناسی III	نثر
۵۔	المجالس المغربیہ	نثر
۶۔	ایثار نامہ	نثر
۷۔	بچوں کے سوالات	نثر
۸۔	علمی خزانہ I	نثر
۹۔	〃 II	نثر
۱۰۔	〃 III	نثر
۱۱۔	〃 IV	نثر
۱۲۔	〃 V	نثر
۱۳۔	پیر ناصرِ خسرو اور روحانیت	نثر
۱۴۔	ثبوتِ امامت	نثر
۱۵۔	جواہرِ حقائق	نظم
۱۶۔	چالیس سوال	نثر
۱۷۔	حروفِ مقطعات	نثر

NEW LS Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science Knowledge for a united humanity

۱۸۔	حقائقِ عالیہ	نثر
۱۹۔	حقیقی دیدار	نثر
۲۰۔	حکمتِ تسبیہ	نثر
۲۱۔	درختِ طوبیٰ*	نثر
۲۲۔	ذکرِ الٰہی	نثر
۲۳۔	روح کیا ہے؟	نثر
۲۴۔	روحانی علاج	نثر
۲۵۔	رموزِ روحانی	نثر
۲۶۔	زبورِ قیامت*	نثر
۲۷۔	سپاسنامہ	نثر
۲۸۔	سو سوال I	نثر
۲۹۔	سو سوال II	نثر
۳۰۔	سو سوال III	نثر
۳۱۔	سو سوال IV	نثر
۳۲۔	سوغاتِ دانش	نثر
۳۳۔	سلسلۂ نورِ امامت	نثر
۳۴۔	عشقِ حقیقی*	نثر
۳۵۔	عطر افشاں	نثر
۳۶۔	علمی علاج	نثر
۳۷۔	علم کی سیڑھی	نثر
۳۸۔	علم کے موتی	نثر
۳۹۔	فلسفۂ دعا	نثر
۴۰۔	قرآن اور روحانیت	نثر

ISW LS
Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

۴۱۔	قرآن اور نورِ امامت	نثر
۴۲۔	قرآنی علاج	نثر
۴۳۔	قرآنی مینار	نثر
۴۴۔	گلہائے بہشت	نثر
۴۵۔	گنجِ گرانمایہ	نثر
۴۶۔	لُبِ لباب	نثر
۴۷۔	لعل و گوہر	نثر
۴۸۔	مطالعۂ روحانیت و خواب	نثر
۴۹۔	معراجِ روح	نثر
۵۰۔	معرفت کے موتی I	نثر
۵۱۔	معرفت کے موتی II	نثر
۵۲۔	مفتاح الحکمت	نثر
۵۳۔	مقالاتِ نصیری I	نثر
۵۴۔	مقالاتِ نصیری II *	نثر
۵۵۔	میزان الحقائق	نثر
۵۶۔	میوۂ بہشت	نثر
۵۷۔	نقوشِ حکمت	نثر
۵۸۔	نورِ ایقان	نثر
۵۹۔	ولایت نامہ	نثر
۶۰۔	ہزار حکمت *	نثر
۶۱۔	یا علی مدد	نثر

فارسی

۶۲۔	آئینۂ جمال	نظم
۶۳۔	اوراقِ منتشر *	نثر

ISW LS Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science Knowledge for a united humanity

۶۴۔	درخت طوبیٰ *	نثر
۶۵۔	جواہر معارف	نظم
۶۶۔	ساٹھ سوال *	نثر
۶۷۔	ہشت سوال	نثر

ترکی

۶۸۔	گلدستہ ترکی *	نظم
۶۹۔	ساٹھ سوال *	نثر

بروشسکی، فارسی، اردو

۷۰۔	کلیات ناصری *	نظم

اردو تراجم از علامہ ناصر ہونزائی

۷۱۔	فصول پاک	نثر
۷۲۔	گلشن خودی	نثر
۷۳۔	مطلوب المؤمنین	نثر
۷۴۔	نور عرفان	نثر
۷۵۔	پند یات جوان مردی	نثر
۷۶۔	شرافت نامہ	نظم
۷۷۔	تجہیز و تکفین	نثر
۷۸۔	وجہ دین حصہ اول	نثر
۷۹۔	وجہ دین حصہ دوم	نثر
۸۰۔	وجہ دین منتخب	نثر

Apart from above, there are Allamah Saheb's ten books in Burushaski, and seventy books that have been translated into English, French and Gujrati.

* Not Published

(June 5, 1992)